ISSN 0974-7346

جون ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۶

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔ لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰ | ماہ ذی قعدہ ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ جون ۲۰۲۳ء | عدد ۶

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

ایک زمانہ تھا جب ہمارے وہ بزرگ جو وقتی سیاست کے شور وشر سے دور اور انتخابی ہنگاموں سے بیزار رہا کرتے تھے۔وہ بھی انتخابات کے بعد کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کبھی کہتے اور لکھتے تھے کہ ان انتخابات نے مسلمانوں کے سامنے عبرتوں کے دفتر کھول دیے ہیں یا یہ کہ آج کل الیکشن کا بحران ہے جس میں نامعقول طریقوں سے اپنی قوت کا اظہار کیا جاتا ہے۔یہ خواہ ۱۹۳۷ء میں زبان قلم سے نکلا ہو یا اب ۲۰۲۳ء میں ان کو دہرایا جائے، حقیقت اپنی ہی جگہ ہے۔واقعہ کوئی بھی ہو عبرت حاصل کرنے کا حکم قرآنی حکمت وتدبر کا وہ حصہ ہے جو نظر والوں کے لیے خاص کیا گیا۔اب نظر ظاہری ہو یا اندرون تک رسائی والی ہو، عبرت پذیری بہر حال شرط ہے۔سیاسی معاشرہ کے انتہائی پست معیار کو دیکھتے ہوئے معارف کے لیے انتخابات اور ان کے مضمرات جیسے موضوع پر اظہار خیال کرنا سچ پوچھیے تو زیب نہیں دیتا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اب ملک عزیز میں انتخابات محض ایک وہ جمہوری عمل نہیں جس میں عوام کو اپنی ضروریات اور ترجیحات ظاہر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ریاست اور اس کے نظم ونسق اور عوام کی فلاح وبہبود کے لیے ایک انتظامی اکائی کو ذمہ داری سپرد کرنے کے ساتھ اس کی کارکردگی کے احتساب کے لیے ایک دوسری متوازی اکائی کے قیام کا اختیار بھی رہتا ہے۔ملک کی آزادی کے بعد جمہوری عمل کا یہ تسلسل اپنی بعض خامیوں اور ناکامیوں کے باوجود بہر حال جاری رہا۔لیکن ایک دہائی سے اس عمل کو جس طرح ایک ہی طبقہ فکر کے نام قوت واقتدار کے سارے سرچشموں کو خاص کر دینے کی سازش کی گئی اور پھر مذہبی تنوع کو تفریق اور تقسیم میں بدل کر انتشار اور اضطراب سے دوچار کیا گیا اس سے صرف اس طبقہ ہی میں بے چینی پیدا نہیں ہوئی جو عددی حیثیت سے کم تھا بلکہ اس عام طبقہ میں بھی اندیشوں کی کمی نہیں رہی جو تعداد میں اکثریت کا درجہ رکھتا ہے لیکن محکومی، پس ماندگی اور سماجی ذلت وبے توقیری میں اس کا درد مذہبی اقلیتوں سے کچھ زیادہ ہی رہا۔ایسے ماحول میں کرناٹک کی ریاستی اسمبلی کے انتخابات کا اعلان گویا آنے والے پارلیمانی انتخاب کے لیے نئے اہتمام اور مقابلہ کے نئے نظام پر غور وفکر کا بھی اعلان تھا۔

***

کرناٹک کے ریاستی انتخاب پر زیادہ توجہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مرکز میں موجود حکمراں، نظریہ قومیت ووطنیت کے فروغ کے لیے ملک کی چاروں سمتوں میں ایک ایک صوبہ کا انتخاب بطور تجربہ گاہ کیا گیا۔مغرب میں گجرات، مشرق میں آسام، شمال میں ہریانہ اور مغربی یوپی اور جنوب میں کرناٹک، یہ

علاقے بطور خاص اس نظریہ کی عملی توسیع کے لیے خاص کیے گئے جو صدیوں سے اس ملک میں رواداری، بقائے باہم اور احترام آدمیت کی روشن روایتوں کے در پے ہے۔ شمال میں تاریخی ثقافت، گجرات میں معاشی استحکام، آسام میں جغرافیائی اہمیت اگر ملک کی سب سے بڑی اقلیت سے نفرت و عداوت کا سبب بنی تو جنوب میں مذہبی اور تجارتی اور تعلیمی رواداری کا مستحکم ماحول، تنگ نظروں کا نشانہ بنا۔ گذشتہ چند برسوں میں کرناٹک میں لوَ جہاد، حجاب، لحم حلال، اکثریتی علاقوں میں اقلیتی دوکانوں سے الجھن، جیسے معاملات میں جس طرح انتہا پسند نظریہ والوں کے ذہن اور ذہن اور زبان میں بگاڑ آیا۔ اس کے نتیجہ میں پورے سماج میں بے چینی کی کیفیت پیدا ہوئی، جس نے ان مسائل پر بھی نظر کرنے کی توفیق دی جو زندگی کے اصل مسائل ہیں۔ مہنگائی، بے روزگاری، بڑھتی غریبی، گاؤں کی ویرانی بڑھا کر چند سرمایہ داروں کے وجود سے شہروں کے محدود پر رونق علاقے اور سیاست کے ذریعہ بدعنوانی کو بے قابو کرتے ہوئے موقع پرستوں کی بڑھتی تعداد نے کرناٹک کے انتخابات میں حزب مخالف کو پہلے اہمیت اور پھر کامیابی دی۔ ظاہر ہے یہ ان لوگوں کے لیے بڑا تازیانہ ثابت ہوا جو مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃ کے نعروں کو اپنی فتح کی ضمانت سمجھ بیٹھے تھے۔ اب مستقبل میں کیا ہوگا یہ تو سیاست کے ماہر نبض شناس ہی بتا سکتے ہیں۔ ہمارے لیے اس ساری طول بیانی کا مقصد، صرف ان حقیقتوں کو یاد کرنا اور یاد دلانا ہے جن کا اظہار معارف اپنے صفحات پر مسلسل کرتا رہا۔ قریب نوے سال پہلے معارف نے کہا تھا کہ ”جنگ عظیم کے بعد سے لے کر آج تک ہم نے بچوں کی طرح سیاسی کھلونوں کے بنانے اور توڑنے کے سوا اور کیا کیا ہے“ جب تک ہم یہ عزم نہ کرلیں کہ ہماری ہمیشہ ایک ہی سیاسی مجلس ہوگی اور جو فرقہ کسی اختلاف کی بنا پر کوئی الگ رائے قائم کرے گا وہ اس مجلس کو توڑنے اور دوسری سیاسی مجلس کے بنانے کے بجائے وہ اس پرانی مجلس کا ایسا فریق اقلیت بن کر رہے گا جو آئینی جدوجہد سے اپنی اکثریت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے گا۔ حق ہے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کے سیاسی انتشار اور اس سے بڑھ کر ملک کی دیگر سیاسی پارٹیوں کے بارے میں رائے قائم کرنے اور احتساب کرنے میں عجلت پسندی کے رویہ نے بھی فسطائی طاقتوں کے عروج کی راہ ہموار کی۔ جنھوں نے کمال ہوشیاری سے سیکولر جماعتوں کے لبادے میں اپنے کارکنوں کو میدان میں اتارا اور ان کے ذریعہ نظریاتی اعتبار سے سیکولرزم پر یقین رکھنے والوں کو کمزور ہی نہیں بے دست و پا کردیا۔ سارا منظر نامہ سامنے ہے، بس دیکھنے کے لیے وہ نظر چاہیے جو سچ کو سچ ہی کی شکل میں دیکھنا پسند کرے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے تب کہا تھا اور ہم اب اسی کو حکمت سلیمانی سمجھ کر بیان کرسکتے ہیں کہ ملکی حالات کے انقلاب کے سبب ضرورت ہے کہ ہم اپنے

خیالات پر پھر ایک نظر ڈالیں اور تعصبات کو چھوڑ کر فکر و عمل کی وحدت کی نئی کوششیں کریں۔

***

نام نہاد اور وقتی مفاد کے لیے سیکولر کہلانے والوں کی ایک تازہ مشکل یہ سامنے آئی کہ مغربی بنگال میں ترنمول کانگریس کی حکومت کے زیر سایہ مغربی بنگال کی سول سروس کے نصاب اور امتحانات کے طریقہ کار میں تبدیلی کی گئی جس سے اب اردو کا لازمی پرچہ ہٹا دیا گیا۔ جو باخبر ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس سے اردو کو لسانی اور معاشرتی نقصان اس طرح ہوگا کہ مغربی بنگال سے اردو ختم ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ یہاں بھی فاعتبروا یا اولی الابصار پڑھنے کا موقع ہے۔

***

اردو کے تعلق سے دہلی پولیس نے جو حکم نامہ جاری کیا ہے وہ بھی جمہوری یکساں حقوق کے لیے تازیانہ عبرت ہے۔ اس میں پولیس تھانوں سے کہا گیا ہے کہ ۳۸۰ اردو الفاظ کا استعمال بند کر دیا جائے۔ اردو والے تو دوسروں کا ظرف دیکھتے رہ گئے لیکن ایک ہندی صحافی ابھے کمار نے صاف کہا کہ جن الفاظ کو غیر مقبول کہا گیا ہے وہ سب بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ ہاں یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ اب پولیس محکمہ اصل کام کو چھوڑ کر شعبہ لسانیات کا فریضہ ادا کر رہا ہے۔

***

افسوس کی ایک خبر یہ ہے کہ ۸ مئی کو مشہور صاحب علم و قلم **مولانا یٰسین اختر مصباحی** نے وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مطالعہ و تحقیق میں گہرائی اور اسلوب میں سنجیدگی و شائستگی اور نفس موضوع پر مرکوز بحث جیسی خوبیاں ان کے قلم کی شناخت بن گئیں۔ ان کا ادارہ دار القلم بھی ان کے اعتدال و توازن کے فروغ کے لیے تھا۔ ان کی تصنیفات کی تعداد کم نہیں۔ مسلم پرسنل لا کے مسائل پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا۔ شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی کے سوانح کے ساتھ ایک ضخیم جلد معارف شارح بخاری کے نام سے مرتب کی اور کئی رسائل جیسے حجاز جدید اور کنز الایمان وغیرہ کی ادارت سے وابستہ رہے۔ جامعہ اشرفیہ سے تحصیل علم کی لیکن جدید عربی ادب سے دلچسپی کی وجہ سے ندوہ سے تخصص بھی کیا۔ طالب علمی کے دور میں بھی ان کی لیاقت کا اعتراف طلبہ کے ساتھ اساتذہ کو بھی رہا۔ فکری اعتدال اور شرافت قلم نے ان کو احترام عام کا مقام دلایا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

***

مقالات

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ
ایک عظیم فکری رہنما

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

اسسٹنٹ پروفیسر وسابق صدر شعبہ اسلامک تھیالوجی، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا

mohdshamimakhter.qasmi@yahoo.com

محی الدین اورنگ زیب عالم گیر (مدت حکومت: ۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) ایک دوراندیش، منتظم، چاق وچوبند، پڑھا لکھا اور دین دار حکمراں تھا۔ اس نے برصغیر میں طویل مدت تک حکم رانی کی۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں رعایا کی خوش حالی، ملک کی تعمیر، علوم وفنون کی ترقی اور علما و دانش وروں کی قدر دانی کی قابل ذکر روایت قائم کی۔ مرنے سے قبل اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ آپسی صلح وخوشی سے سلطنت کو تین حصوں میں تقسیم کرلیں گے۔[1] تاکہ اس وسیع وعریض سلطنت کا نظم ونسق میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ مگر افسوس ہے کہ ان کے فرزندوں نے اس پر عمل نہیں کیا اور آپسی جنگ وجدال، غیر ذمہ دارانہ رویے، خلاف شرع امور اور حد سے بڑھی ہوئی عیش وعشرت کی بنا پر ایک بنی بنائی سلطنت کو پلک جھپکتے ہی خاک میں ملا دیا۔ اس کمزوری کا فائدہ قرب وجوار کے راجوں مہاراجوں نے اٹھایا اور سلطنت سے بغاوت کرکے جگہ جگہ خود مختار ریاستیں قائم کرلیں۔ مزید برآں مرہٹے، جاٹ، سکھ اور روہیلوں نے مل کر سلطنت کو تہ وبالا کردیا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے بار بار کے حملوں اور لوٹ کھسوٹ سے ملک کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، مذہبی اور اقتصادی صورت حال مزید خراب ہوگئی، جس کے منفی اثرات سے عام لوگ دوچار تھے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ (۱۹۲۵-۱۹۹۷ء) کے بہ قول: اس وقت دہلی ''بمنزلہ لعب صبیان'' تھا۔ دکن سے جو طوفان اٹھتا تھا وہ لال قلعہ سے آکر ٹکراتا تھا۔ پنجاب سے جو آندھی اٹھتی تھی اس کے زلزلے دہلی میں محسوس ہوتے تھے۔ جاٹوں کا جو ہنگامہ برپا ہوتا تھا اس

---

[1] پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، مشتاق بک کارنر، لاہور، سنہ ندارد، ص: ۳۱۷۔

کی جولان گاہ یہی بدبخت شہر بنتا تھا۔[۲] سلطنت کی بربادی اور افراتفری کا مشاہدہ ایسٹ انڈیا کمپنی بہت قریب اور گہرائی سے کررہی تھی، موقع پاتے ہی اس نے اسلام دشمن اندرونی طاقتوں سے ساز باز کرکے ملک کے الگ الگ حصوں پر قبضہ کرنا شروع کردیا، یہاں تک کہ وہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد یہاں کی مختار کل ہوگئی۔ مغلیہ سلطنت کے عروج وزوال کا سانحہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ زوال پذیر سلطنت کو بچا تو نہیں سکتے تھے، البتہ انہوں نے اپنی تمام علمی وفکری صلاحیت اس امر میں صرف کردی کہ کوئی ایسی سبیل نکل کر سامنے آئے جس کے ذریعہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ بحال کی جائے اور مسلم معاشرہ کو مذہبی واخلاقی اقدار کا پابند بنایا جائے۔ زیر نظر مضمون میں شاہ عبدالعزیزؒ کی اسی سرگرمی کا مطالعہ مقصود ہے۔

پیدائش اور تعلیم وتربیت

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۱/اکتوبر ۱۷۴۶ء/۲۵/رمضان ۱۱۵۹ھ کو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کی دوسری زوجہ ''ارادت بیگم'' کے بطن سے پیدا ہوئے۔[۳] ان کی ولادت سے شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ شروع سے ہی ان کی تعلیم وتربیت اور پرورش وپرداخت پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ پانچ سال کی عمر میں وہ حفظ کلام اللہ کی دولت سے سرفراز ہوگئے۔ عربی وفارسی کی کتابیں شاہ ولی اللہؒ سے ہی پڑھی۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہؒ کے مخصوص رفقا مولانا عاشق پھلتیؒ، مولانا امین کشمیریؒ اور مولانا نوراللہؒ سے قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔[۴] پندرہ سال کی عمر میں بہ قول مولوی عبدالقادر خانیؒ (۱۷۸۰-۱۸۴۹ء): علم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور

---

[۲] پروفیسر خلیق احمد نظامی، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص: ۱۷-۱۸۔

[۳] عبدالرحیم ضیا، مقالات طریقت (تحقیق وتدوین: پروفیسر محمد اقبال مجددی) پروگیسو بکس، لاہور، ۲۰۱۷، ص: ۶۷۔ سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۱۰، ج: ۵، ص: ۳۴۶-۳۴۷

[۴] سید عبدالحہ حسنی، نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر، دار ابن حزم، بیروت، ۱۹۹۹ء، ج: ۱۰، ص: ۱۰۱۴۔ رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند (مرتبہ: محمد ایوب قادری) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص: ۳۰۲-۳۰۳۔ فقیر محمد جہلمی، حدائق الحنفیہ (مرتبہ مع حواشی: خورشید احمد خاں) مکتبہ ربیعہ، کراچی، سنہ ندارد، ص: ۴۸۷-۴۸۸

تاریخ میں شہرہ آفاق تھے اور ہیئت، ہندسہ، مجسطی، مناظر، اصطرلاب، جر ثقیل، طبعیات، الٰہیات، منطق، مناظرہ، اتفاق، اختلاف، ملل، نحل، قیافہ، تاویل، تطبیق، مختلف اور تفریق مشتبہ وغیرہ کی تعلیم سے فارغ ہوگئے اور اس میں یکتائے زمانہ بن گئے۔ فن ادب اور ہر قسم کے اشعار سمجھنے میں بلند مرتبہ ہوگئے۔[۵] یہاں تک کہ اپنے والد گرامی کے ہاتھوں مختلف سلاسل میں بیعت ہوئے اور ان سے خلافت واجازت حاصل کی۔ شاہ صاحب نے خود فرمایا: ''جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے ایک سو پچاس ہیں، نصف سابقین اولین کے اور نصف اس امت کے ہیں۔''[۶] عبرانی زبان سے بھی واقف تھے۔[۷] عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں وہ درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور اس میں انہیں استاذی کا درجہ حاصل تھا۔ بڑے بڑے شعراء ان کی زبان دانی کے معترف اور ان کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔[۸] ملفوظات عزیزی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا کہ شاہ عبدالعزیز ایک ماہر ریاضی داں اور جغرافیہ داں کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔[۹] ''کمالات عزیزی'' جو شاہ صاحب کے کشف وکرامات پر مبنی رسالہ ہے، کے مندرجات سے پتا چلتا ہے کہ وہ کشف وکرامات میں مسلم تھے اور تعبیر خواب بیان کرنے میں بھی انہیں درک حاصل تھا۔

درس وتدریس کا آغاز اور مقبولیت

حصول علم کے تمام مراحل سے گزرنے کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ والد گرامی کی موجودگی میں مدرسہ رحیمیہ دہلی میں پڑھانے کے لئے مامور کئے گئے۔ درس شروع کیا تو علم وتحقیق کے موتی بکھیرنے لگے، جس سے بہت جلد ان کی شہرت ہوگئی۔ طلبا دور دور سے یہاں آنے لگے۔ شاہ صاحب کے درس کی

---

[۵] مولوی عبدالقادر خانی، علم وعمل (مترجم معین الدین افضل گڑھی) اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی، ۱۹۶۰ء، ص: ۲۴۶

[۶] شاہ عبدالعزیز، ملفوظات عزیزی (مترجمین: محمد علی قریشی، ومفتی انتظام اللہ شہابی)، پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۶۰ء، ص: ۹۱

[۷] ملفوظات عزیزی، ص: ۷۷

[۸] حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی، لال قلعہ کی ایک جھلک (مرتبہ: ڈاکٹر انتظار مرزا) اردو اکیڈمی، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص: ۶۴-۶۵

[۹] ملفوظات عزیزی، ص: ۱۱۰

مقبولیت کی شہادت متعدد سوانحی کتب اور تذکروں میں ملتی ہے۔ سبھی نے ان کی غیر معمولی استعداد اور مقناطیسی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔[۱۰] سید عبدالحی حسنیؒ (۱۸۶۹-۱۹۲۳ء) اپنی مشہور زمانہ عربی تصنیف میں لکھتے ہیں:

> شاید تم کو تعجب ہو گا کہ موصوف تکلیف دہ بیماریوں اور اندوہ ناک امراض کے باوجود خوش طبع، حاضر جواب، شیریں گفتار، بڑے فصیح، خوش کلام، متواضع ہشاس بشاس اور باوقار تھے، ان کے اوصاف کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، ان کی مجلسیں عقول اور اذہان کی سیر و تفریح کا سامان تھیں، ان کی حکایتیں کانوں کو، ان کے شائستہ اشعار طبائع کو بھاتے تھے اور دور دراز کے قصے اور وہاں کے باشندوں کی داستانیں بھی خوب ہوتی تھیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ سننے والے کو یہ گمان ہوتا تھا کہ موصوف نے ان باتوں کو دیکھ کر جانا ہے، حالاں کہ بات یہ تھی کہ انہوں نے کلکتہ کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا، غیر معمولی ذکی، قوی تصور تھے اور حقائق سے خوب بحث کرتے تھے، انہوں نے ان باتوں کو ان لوگوں سے سنا تھا جو دور دراز سے دارالسلطنت میں آتے تھے۔[۱۱]

شاہ عبدالعزیزؒ کے درس کا حال بیان کرتے ہوئے مولوی عبدالقادر خانی لکھتے ہیں:

> منقول میں کلام اللہ اور حدیث سے دلیل پیش کرتے تھے اور معقول میں جو ثبوت مناسب سمجھتے، خواہ مخواہ یونانیوں میں سے افلاطون، ارسطو اور متکلمین سے فخر رازی وغیرہ کے اقوال کی تائید میں مبتلا نہیں ہوتے تھے اور اپنی تحقیقات کو فن معقول میں صاف صاف بیان کر دیتے تھے چاہے وہ کسی کی رائے کے موافق ہو یا نہ ہو۔[۱۲]

شاہ عبدالعزیزؒ شاہ ولی اللہؒ کی حیات یعنی دو سالوں تک ان کے زیر سایہ پڑھاتے رہے۔ جب شاہ ولی اللہؒ کا انتقال ہو گیا تو مدرسہ امینہ کی مسند درس سنبھالنے کے علاوہ دیگر تمام ذمہ داریاں بھی ان کے سپرد کر دی گئیں۔ ان کی توجہ اور کوششوں کے نتیجے میں بڑی تعداد میں رجال کار تیار ہوئے۔ مولانا صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالیؒ (۱۸۳۲-۱۸۹۰ء) لکھتے ہیں:

---

[۱۰] سر سید احمد خاں، آثار الصنادید (بہ ضمن دہلی اور اہل دہلی کے حالات) مطبع نامی، منشی نول کشور، لکھنؤ، سنہ ندارد، ص: ۳۹

[۱۱] نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، ج: ۱۰، ص: ۱۰۱۵

[۱۲] علم و عمل، ص: ۲۴۶

بلاد ہند میں علم و عمل کی سیادت ان پر اور ان کے بھائیوں پر ختم تھی۔ دیار ہند کے علما ہی میں نہیں بلکہ بیرون ہند میں بھی کم ہی کوئی ایسا عالم ہوگا جو تلمذ یا استفادہ باطن کی نسبت اس خاندان سے نہ رکھتا ہوگا، ان کی شاگردی بڑے بڑے علما کے لئے باعث فخر ہے اور ان کی لکھی ہوئی کتابیں فضلا کے معتمد علیہ ہیں۔ فقیر کے والد کو بھی ان سے روایت کی اجازت حاصل ہے، موصوف نے علوم کی تحصیل اپنے اور ان کے خلفا سے کی اور بڑی خلقت نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کے علوم تحصیلیہ فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ کی سندیں ان کی تصانیف میں مذکور ہیں اور لوگوں میں مشہور ہیں۔[13]

مولانا عبید اللہ سندھیؒ (۱۸۷۲-۱۹۴۴ء) لکھتے ہیں:

اگر اس وقت یورپ کی ایک بڑی عقل مند انقلابی حکومت ہندوستان میں پاؤں نہ جما چکی ہوتی تو شاہ عبدالعزیزؒ کے علوم کا آج یہاں اقتدار ہوتا۔ لیکن یہ یورپی حکومت صرف شاہ عبدالعزیزؒ کے علوم کے برگ و بار لانے میں سد راہ ثابت نہ ہوئی بلکہ اس کی تدبیروں نے ان علوم کی صورت کو اس طرح مسخ کیا کہ عوام ان سے متنفر ہو گئے۔ البتہ جن لوگوں میں علمی ذوق موجود تھا، وہ اس مخالف پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوئے۔[14]

تبحر علمی اور کمالِ حافظہ

خاندان ولی اللّٰہی کی برصغیر میں سربلندی مقدر ہو چکی تھی۔ اس لئے منجانب اللہ اس کے لئے اسباب بھی مہیا ہوتے رہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ سے پہلے اور اس کے بعد اس خاندان کا ہر فرد متقی عالم بے بدل اور محقق دوراں تھا۔ وہ اپنی اصل ذمہ داریوں کے تئیں فکر مند رہتے۔ ۲۵ سال کی عمر سے ہی شاہ صاحب متعدد مہلک بیماریوں کے بھی شکار ہو گئے تھے۔[15] بصارت سے محروم ہو گئے تھے، پھر بھی حافظہ نسخہ لوح تقدیر تھا۔[16] مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں: شاہ صاحب

---

[13] صدیق حسن خاں قنوجی، اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین، مطبع نظامی، کان پور، ص: ۲۹۶-۲۹۷

[14] عبید اللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک (پروفیسر محمد سرور) سندھ ساگر اکادمی، لاہور، اشاعت دوم، سنہ ندارد ص: ۵۲

[15] تاریخ دعوت و عزیمت، ج: ۵، ص: ۳۴۹

[16] آثار الصنادید، ص: ۴۰

کو چھ ہزار احادیث از بر تھیں۔[۱۷] سید عبدالحی حسنیؒ نے اپنے سفر نامہ ''دہلی اور اس کے اطراف'' میں شاہ عبدالعزیزؒ کی قوت حافظہ کا ذکر کیا ہے، جسے انہوں نے مولانا ذوالفقار علیؒ صاحب کی زبانی سنا تھا:

مجھ سے مولانا رشید الدین خاںؒ صاحب بیان کرتے تھے کہ جب شاہ صاحب معذور ہو گئے اور امراض سخت میں گرفتار ہو گئے تو مراق کی وجہ سے اکثر مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے۔ اسی درمیان میں بعض بعض لوگ سبق بھی پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ میں مقامات حریری پڑھتا تھا۔ آگے آگے شاہ صاحب اور پیچھے پیچھے میں مقامات لئے ہوئے پڑھتا جاتا تھا۔ مقامات کی عبارت دو فقری ہے۔ میں ایک فقرہ پڑھتا تھا، دوسرا شاہ صاحب معاً پڑھ دیتے تھے۔ یا تو یہ فقرہ وہی ہوتا تھا جو کتاب کا ہے، یا انہی کا ہوتا تھا جو کتاب کے فقرہ سے زیادہ چست اور اچھا ہوتا تھا۔[۱۸]

مولانا ذوالفقارؒ صاحب نے شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد مولانا رشید الدینؒ (۱۷۶۵-۱۸۳۴ء) کی زبانی ایک دوسرا واقعہ سنا تھا، جس سے مولانا حسنیؒ کو واقف کرایا گیا:

ایک مرتبہ سفر کلکتہ میں شاہ صاحب نے قاموس کا ایک نسخہ دیکھا تھا، مدتوں کے بعد نابینا ہو جانے پر وہ دہلی فروخت کے واسطے دست بدست شاہ صاحبؒ کے مدرسہ پہنچا۔ شاہ صاحبؒ نے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کو میں نے دیکھا ہے، پھر فرمایا کہ دیکھو فلاں حاشیہ پر یہ عبارت تو نہیں لکھی ہے۔ دیکھا گیا تو یہ وہی تھی۔ آخر کو معلوم ہوا کہ یہ وہی نسخہ ہے۔[۱۹]

افادہ عام کی علمی مجالس

شاہ عبدالعزیزؒ نے قرآن وحدیث کی تدریس کے ساتھ عوام الناس اور کم پڑھے لکھے لوگوں میں دین کی روح پھونکنے کے لئے الگ سے بھی مجلس آراستہ کی۔ اس کے لئے دو دن متعین کئے گئے تھے۔ ''آپ فجر کی نماز کے بعد درس دیتے تو شرکاء کی کثرت ہوتی تھی۔ چہل قدمی کے دوران بھی کئی اصحاب آپ

---

[۱۷] اشرف علی تھانوی، الافاضات الیومیۃ من الافادات القومیۃ، مکتبہ دانش دیوبند، سنہ ندارد، ج: ۱، ص: ۲۷۰

[۱۸] سید عبدالحہ حسنی، دہلی اور اس کے اطراف (مرتبہ: صادق ذکی)، اردو اکیڈمی، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص: ۸۸۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت (مرتب ومحشی: مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی) سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۵۴

[۱۹] دہلی اور اس کے اطراف، ص: ۸۸

سے سبق پڑھتے تھے اور جب تفسیر بیان کرتے تب بھی حاضرین میں ایسے افراد ہوتے جو تعلیم کی درخواست کرتے تھے۔ ان سب کے علاوہ وہ اصحاب بھی تھے جو عربستان اور دیگر ممالک سے آتے اور اجازت لے کر چلے جاتے"۔[۲۰]

شاہ عبدالعزیزؒ کا حلقہ درس لگتا، چاہے قرآن کا ہو یا حدیث کا، یا پھر وعظ وارشاد کی مجلس، ہر جگہ مخاطب کے ذہن کا خیال رکھتے ہوئے کلام کرتے۔ مولوی عبدالقادر خانی لکھتے ہیں: وہ اپنی گفتگو میں بلا ضرورت یونانیوں، افلاطون، ارسطو اور متکلمین میں سے فخر الدین رازی وغیرہ کی بحثوں کی الجھنوں میں مبتلا نہیں ہوتے اور اپنے مدعا کو معقول میں صاف صاف بیان کردیتے، چاہے وہ کسی کی رائے ہو یا نہ ہو۔[۲۱] شرکا میں سب کو اجازت تھی کہ کوئی اشکال ہو یا کوئی بات فہم سے بالاتر ہو تو دریافت کرلے۔ شیخ عبدالرحیم ضیا ان کے طریقہ تدریس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> آپ کے وعظ میں ہزارہا آدمی رہتے تھے، ان میں جو پڑھے لکھے تھے وہ لوگ ایک ایک تفسیر اپنی اپنی استعداد کے موافق عربی ہو یا فارسی لے کر بیٹھے رہتے۔ جب کوئی ایک آیت شروع کرتے تو حضرت ہر ایک سے پوچھتے کہ امام رازی کیا معنی کرتے ہیں؟ اور شیخ محی الدین ابن عربی کیا فرماتے ہیں؟ اور قاضی بیضاوی کیا لکھتے ہیں؟ علیٰ ہذالقیاس، جس کے پاس جو تفسیر ہوتی وہ اپنا بیان کرتا، جب تفسیریں ہوجاتیں تب آپ فرماتے: خیر یہ سب بیان ہوچکا۔ اب جو خدا تعالیٰ نے اس فقیر کے دل میں القا کیا ہے بیان کرتا ہوں، پھر وہ مضامین فرماتے کہ کسی مفسر کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئے ہوں، سب لوگ کتابیں بند کر کے حضرت کا منھ تکتے رہتے اور ششدر ہوجاتے۔[۲۲]

مقام ومرتبہ

شاہ عبدالعزیزؒ ہمیشہ اپنی ذمے داریوں کو لے کر بڑے پابند اور فکر مند رہتے۔ سخت بیماری میں مبتلا رہنے کے باوجود چلتے پھرتے بھی طلبا کو پڑھاتے اور خلفا و مریدین اور عوام الناس کی تعلیم وتربیت پر توجہ فرماتے تھے۔ اس بے لوث خدمت نے ان کو عوام وخواص میں مقبول بنادیا۔ سلاطین وامرا بھی ان کی عزت

---

[۲۰] مقالات طریقت (مقدمہ)، ص: ۳۶

[۲۱] علم وعمل، ص ۲۴۶

[۲۲] مقالات طریقت، ص: ۷۷

کرتے اور عقیدت و محبت سے پیش آتے اور اپنے لئے دعا کی درخواست کرتے تھے۔ شیخ محمد محسن بن یحیٰ ترہتیؒ (۱۸۶۴ء) اپنی کتاب ''الیانع الجنی'' میں شاہ صاحب کی عوام الناس میں مقبولیت اور ان کے علمی وروحانی فیوض و برکات کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

وہ شہرت و کمال کی اتنی بلندی پر پہنچ گئے تھے کہ ہندوستان کے لوگ ان کی جانب نسبت کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، بلکہ اپنے آپ کو ایسے رشتے میں منسلک کرنے میں جو ان کے شاگردوں پر منتہی ہوتا ہے قابل فخر خیال کرتے ہیں، ان کے خصائل حمیدہ اور اخلاق فاضلہ ایسے ہیں کہ جن میں ان کے عام ہم عصر ان سے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے، جس نے بھی ان سے مقابلہ کیا وہ ان ہی کے نشانہ پر گرا، اس نے انہی نشانہ پر تیر چھوڑا، اور اس کے طور و طریق کو اختیار کیا، اور ان کے من جملہ محاسن کے عبارت آرائی اور انشاپردازی میں فائق ہونا اور اس میں سحر آفرینی کا پایا جانا ہے، ان کی تحریریں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ان کے معاصرین نے ان کو اپنا پیش رو مانا اور سب نے اس امر کو تسلیم کیا کہ وہ میدان مسابقت میں گوئے سبقت لے جانے والے ہیں اور نشان پر قبضہ کرنے والے ہیں، اور من جملہ اس کے ان کی فراست ہے جس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ان کو خوابوں کی تعبیر پر قدرت عطا فرمائی، جیسی تعبیر بتاتے ویسی ہی ہوتی، گویا ایسی خبر دی جیسے کہ خود انہوں نے اس کو دیکھا ہے، یہ باتیں ایسے نفوس قدسیہ سے ظہور میں آتی ہیں جو خواہشات نفسانی کی آلودگیوں سے پاک صاف ہوتے ہیں، ان کے خصائل حمیدہ بہت ہیں اور ان کے فضائل مشاہدہ میں آچکے ہیں۔[۲۳]

شاہ ولی اللہ محدثؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے علمی کمالات اور ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے بڑا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

امام ولی اللہؒ نے تو دہلی کے اعلیٰ طبقے کو اپنے علوم وافکار سے متعارف کرایا تھا، مگر امام عبدالعزیزؒ نے قوم کے متوسط طبقے کو بیدار کر کے عوام کو اس حقیقت سے آشنا کیا۔ یہی قومی حکومت کی تاسیس ہے۔ بفضلہ تعالیٰ امام عبدالعزیزؒ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے اور اسی بنا پر ''سراج الہند'' کہلائے۔[۲۴]

---

[۲۳] محمد محسن بن یحییٰ الترہتی، الیانع الجنی من اسانید الشیخ عبدالغنی (تحقیق: ڈاکٹر ولی الدین تقی الدین ندوی) اروقة للدراسات والنشر، عمان، اردن، ۲۰۱۶ء، ص: ۱۴۹

[۲۴] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص: ۵۷

سر سید احمد خاںؒ لکھتے ہیں:

یہ آفت جو اس جزو زمان میں تمام دیار ہندوستان خصوصا شاہ جہاں آباد حرسہا اللہ عن الشر والفساد میں مثل ہوائے وبائی کے عام ہوگئی ہے کہ ہر عامی اپنے تئیں عالم اور ہر جاہل اپنے آپ کو فاضل سمجھتا ہے اور فقط اسی پر کہ چند رسالے مسائل دینی اور ترجمہ قرآن مجید کو اور وہ بھی زبان اردو میں کسی نے استاذ سے اور کسی نے اپنے زور طبیعت سے پڑھ لیا ہے اپنے تئیں فقیہ و مفسر سمجھ کر مسائل و وعظ گوئی میں جرأت کر بیٹھا ہے۔ آپ کے ایام حیات تک اِس کا اثر نہ تھا، بلکہ علماء متبحر اور فضلائے مفضی المرام باوجود نظر غائر اور احاطہ جزئیات مسائل کو جب تک اپنا سمجھا ہوا حضرت کی خدمت میں عرض نہ کر لیتے تھے اس کے اظہار میں لب کو وانہ کرتے تھے اور اس کے بیان میں زبان کو جنبش نہ دیتے تھے۔

تلامذہ، خلفا اور مریدین

شاہ عبدالعزیزؒ چاروں بھائیوں میں بڑے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ کے انتقال کے وقت یہ سب سے چھوٹے تھے۔ لہذا سب ان کی نگرانی و کفالت میں آگئے۔ انھوں نے بھائیوں کے ساتھ حد درجہ شفقت و محبت کا معاملہ روا رکھا اور ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی۔ جس کی وجہ سے یہ سب شاہ ولی اللہ کے علمی وراثت کے امین بن گئے اور ان کے علمی کاموں میں معاونت کرنے لگے۔ عقلی مسائل کے لئے جس قدر تحقیق کی ضرورت ہوتی، اس کو شاہ رفیع الدینؒ پورا کرتے رہے۔ کشفی مسائل میں خصوصیت کے ساتھ شاہ عبدالقادرؒ ممتاز تھے۔ نقلی علوم کی تعلیم شاہ صاحب کے اپنے ذمہ تھی۔ اس طرح علم کے تینوں ذرائع یعنی عقل، نقل اور کشف کی مدد سے ایک جامع سوسائٹی پیدا کرنے کی کوشش جاری رہی۔[۲۵] یہی وجہ ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ اپنے بھائیوں کی علمی استعداد اور فراست کے ہمیشہ معترف رہے، بلکہ بعد میں بیماری لاحق ہونے کی وجہ سے اپنی تدریسی اور دیگر ذمہ داریاں اپنے بھائی شاہ رفیع الدینؒ (۱۷۴۹-۱۸۱۸ء) کے سپرد کر دی تھی۔[۲۶] اپنے تلامذہ اور خلفا خاص کے بارے میں شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں:

---

[۲۵] ماخذ سابق، ص: ۵۳

[۲۶] ملفوظات عزیزی، ص: ۱۶۱

میرے شاگردوں میں دو آدمی نہایت لائق اور عمدہ ہیں۔ مولوی رفیع الدینؒ اور مولوی الٰہی بخشؒ جو بقید حیات ہیں اور کلکتہ میں مولوی مراد علیؒ ہیں اور انہوں نے پڑھنے پڑھانے کا شغل چھوڑ دیا ہے، تجارت کرتے ہیں اور بقیہ دوسرے شاگرد فوت ہوگئے۔[۲۷]

ان سب کے علاوہ بھی اور بہت سے نام ور تلامذہ اور خلفا تھے، جن کی تعداد بہ قول معروف محقق پروفیسر محمد اقبال مجددیؒ (۱۹۵۰-۲۰۲۲ء) ۱۲۳ء تک پہنچتی ہے،تاہم وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ ہماری ہر فہرست نامکمل ہے۔[۲۸] البتہ صاحب ''مقالات طریقت'' یہ بھی لکھتے ہیں: آپ کے مریدین کی کثرت تھی، جن کی تعداد چالیس لاکھ ہے'۔[۲۹] جن میں ان کے تینوں برادر خورد شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ (۱۷۵۳-۱۸۱۴ء) اور شاہ عبدالغنیؒ (۱۷۵۸-۱۸۱۲ء) کے علاوہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ (۱۷۷۹-۱۸۳۱ء) اور سید احمد شہیدؒ (۱۷۸۶-۱۸۳۱ء)، شاہ محمد اسحاقؒ (۱۷۸۳-۱۸۴۶ء)، شاہ محمد یعقوبؒ (۱۸۶۵-۱۷۸۶ء)، مفتی صدر الدین دہلویؒ (۱۷۸۹-۱۸۶۸ء)، شاہ غلام علیؒ (۱۷۴۳-۱۸۲۴ء)، مولوی مخصوص اللہؒ (۱۸۵۴ء)، مولوی عبدالحیؒ (۱۸۲۷ء)، مولانا میر محبوب علی (۱۷۸۶-۱۸۶۵ء)، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (۱۸۹۵-۱۹۹۳ء) وغیرہ ہیں۔ سبھی نے چراغ سے چراغ جلائے اور برصغیر کی بگڑی ہوئی معاشرت پر توجہ مرکوز کی۔ شاہ ولی اللہؒ کے خواص شاگردوں سے اگر دس آدمیوں نے استفادہ کیا تو شاہ عبدالعزیزؒ کے خواص شاگردوں سے دس ہزار مستفید ہوئے۔[۳۰]

تقریر و خطابت کی سحر انگیزی

شاہ عبدالعزیزؒ ایک دن ارشاد و تلقین کی مجلس میں مریدین و متوسلین سے مخاطب تھے۔ کسی بات پر شاہ صاحب نے فرمایا: والد محترم شاہ ولی اللہؒ کا درس بڑا مقبول تھا اور ان کی تحریر و تقریر بڑی مرصع ہوتی تھی۔ اس پر مجلس میں موجود ایک صاحب نے عرض کیا: حضرت کی تقریر بھی مرصع ہوتی ہے کہ عوام

---

[۲۷] ماخذ سابق،، ص: ۹۵

[۲۸] مقالات طریقت (مقدمہ)، ص: ۳۶-۴۶

[۲۹] ماخذ سابق، ص: ۷۸؛ نسیم احمد فریدی امروہوی، تذکرہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، الفرقان بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۸

[۳۰] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص: ۵۲-۵۱

اس کو سن کر جھومنے لگتے ہیں۔[۳۱] اس سے اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ وہ ایک بہترین مقرر اور واعظ بھی تھے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے اور علمی کاموں میں مشغول رہتے، بادشاہ اور امرا کی مصاحبت پسند نہیں کرتے تھے، مگر دینی مصالح کے تحت بعض وقت اس کو بھی گوارا کر لیتے تھے۔ اس تناظر میں ایک موقع سے انہوں نے جو بات فرمائی اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑے بے نیاز آدمی تھے اور ان کا وعظ بہت موثر تھا:

> غازی الدین حیدر بلا منصب و جاگیر مجھے طلب کرے تو میں جانے کو تیار ہوں، بشرطیکہ تعرض نہ کرے اور انشاء اللہ خلقت الٰہی کو بڑی ہدایت ہوگی اور میں اپنی تقریر میں مناسب تبدیلی کر کے اس کو زیادہ مفید بنادوں گا اور نئے انداز کی تقریر کروں گا جو عوام میں مقبول ہوگی اور لوگ فریفتہ ہوں گے۔[۳۲]

شاہ عبدالعزیزؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اس وقت مجھے اپنے قتل کئے جانے کا غم نہیں ہوگا، مگر ایسی موت بھی ناپسندیدہ ہے کہ بے وجہ مارا جاؤں۔ اس کا یہ مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے پیش نظر بعض دوسرے امور تھے، جنہیں حتمی انجام تک پہنچانے کی سعی مشکور میں لگے ہوئے تھے اور ایسا لگتا ہے کہ ان کے مقاصد جلیلہ میں ایک مقصد یہ بھی رہا ہوگا کہ ایسے افراد تیار کئے جائیں جو آگے چل کر برصغیر کی تاریخ کو نیا موڑ دے سکیں اور یہاں کے باشندوں کو غلامی سے نجات دلا سکیں۔ بہر حال شاہ عبدالعزیزؒ کی مجلس وعظ وارشاد اور درس قرآن میں ہر طبقہ کے لوگ شرکت کرتے اور سب مطمئن ہو جاتے تھے۔ ملفوظات عزیزی میں ہے:

> آپ کی تقریر میں بلا کا جادو تھا، جس کا مخالف و موافق پر برابر اور یکساں اثر پڑتا تھا۔ آپ کی شیوا بیانی اور سلجھی ہوئی تقریر کی تمام ہندوستان میں دھوم تھی اور یہ بات تمام لوگوں میں مشہور تھی کہ شاہ عبدالعزیزؒ نے وہ طرز اختیار کیا ہے کہ ان کی مجلس وعظ سے ہر مذہب وملت کا شخص خوش ہو کر اٹھتا ہے۔ متعصب اور ہٹ دھرم لوگ بھی آپ کی بات بلا تردد تسلیم کرتے اور حسن تقریر کے آگے اطاعت کی گردنیں جھکا دیتے تھے۔ خواص و عوام مور وملخ سے زیادہ جمع ہوتے۔ معترضین پہنچتے، مگر سوال نہ بن پڑتا، تقریر میں جو جواب مل جاتا۔[۳۳]

---

[۳۱] ملفوظات عزیزی، ص: ۱۵۸

[۳۲] ماخذ سابق، ص: ۱۱۱

[۳۳] ملفوظات عزیزی، ص: ۱۵

مساعیِ فہم قرآن

شاہ ولی اللہؒ نے بڑی جدوجہد کی کہ مسلم معاشرے میں فہم قرآن کا ایک عام مزاج بنے اور لوگوں کا تعلق سرچشمہ ہدایت سے مضبوط ہو جائے۔ شاہ ولی اللہؒ کے انتقال کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ نے بھی اس سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ طلبا کے درس کے علاوہ افادہ عام کے لئے ہفتے میں دو دن منگل اور جمعہ کو الگ سے درس قرآن کی مجلس لگتی، جس میں خلق کثیر کی بھیڑ جمع ہو جاتی تھی۔ انہوں نے اپنے درس قرآن کی شروعات اسی آیت کے بعد سے کی جہاں ان کے والد نے چھوڑا تھا۔ شاہ اسحاق بن افضلؒ پہلے ایک رکوع کی تلاوت کرتے، پھر شاہ صاحب دیر تک اس کی تفسیر بیان فرماتے اور اس سے حاصل دروس ونصائح کی وضاحت کرتے تھے۔ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد اس سلسلے کو ان کے نواسے شاہ اسحاقؒ نے آگے بڑھایا۔[۳۴] دراصل یہ اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ لوگوں نے قرآن کو کتاب ہدایت کی بجائے دعا، تعویذ، گنڈوں اور فاتحہ خوانی کی کتاب سمجھ لیا تھا اور اس سے حد درجہ لاپرواہی برتی جاتی تھی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ کے درس قرآن سے مسلمانوں کے اندر کلام اللہ سے شغف پیدا ہوا۔ ملفوظات عزیزی کے مترجم لکھتے ہیں:

> قرآن کے مطالعہ کی طرف قطعاً توجہ نہ تھی۔ وہ صرف بیماروں کی جھاڑ پھونک کے لئے کھولا جاتا تھا۔ قرآن سے بے توجہی کو دور کرنے اور لوگوں کو اس طرف رغبت دلانے اور شوق پیدا کرنے کے لئے قرآن کا ترجمہ شاہ ولی اللہؒ نے فارسی زبان میں کیا تھا، بعد میں ان کے بیٹے شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے اردو زبان میں علیحدہ علیحدہ ترجمے کئے۔ ان تراجم کی وجہ سے لوگوں میں قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی مسلسل کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں قرآن شریف کی تلاوت نہ ہوتی ہو اور یہ رجحان ومیلان اس حد تک بڑھ گیا کہ بچوں کو پہلے قرآن کی تعلیم دلاتے تھے اور جابجا مسجدوں، خانقاہوں میں تعلیم قرآن کے مکاتیب ومدارس قائم ہو گئے۔ آج تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ قرآن شریف کی طرف رغبت دلانے اور اس کی تعلیم کو عام کرنے میں شاہ صاحب کی تبلیغی مساعی کو بہت بڑا دخل ہے۔[۳۵]

---

[۳۴] نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر، ج: ۱۰، ص: ۱۰۱۴

[۳۵] ملفوظات عزیزی (مقدمہ مترجمین)، ص: ۲۲

خاندان ولی اللہ کو یہ اعزاز وافتخار حاصل ہے کہ اس کے ہر فرد نے خدمت قرآن پر خصوصی توجہ دی۔ مگر شاہ عبدالعزیزؒ کی برسوں پر محیط یہ کوشش بڑی برگ وبار ثابت ہوئی۔ مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ (۱۹۲۵-۲۰۱۵ء) لکھتے ہیں:

> برصغیر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کو اللہ تعالیٰ نے جو قدر و منزلت عطا فرمائی، وہ اس خطۂ ارض کی اسلامی ودینی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔ اس خاندان نے سب سے زیادہ خدمات سرانجام دیں۔ قرآن، حدیث، تفسیر، اصول فقہ، تصوف، جہاد غرض ہر میدان علم و عمل میں اس خانوادہ عالی مرتبت کے ارکان ذی احترام پیش پیش رہے بلکہ بعض خدمات علمیہ کا آغاز ہی اس گھرانے سے ہوا۔ قرآن مجید کے فارسی اور اردو تراجم کی ابتدا انہی بزرگوں نے کی۔ شاہ ولی اللہؒ کا فارسی ترجمہ و تفسیر، شاہ عبدالعزیزؒ کی تفسیر عزیزی، شاہ عبدالقادرؒ کا اردو ترجمہ قرآن اور تفسیر موضح قرآن، شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ وہ اولین خدمات ہیں جو تاریخ کے سینے میں قیامت تک نقش رہیں گی اور لوگ ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔[۳۶]

شاہ عبدالعزیزؒ کے درس قرآن سے برآمد ہونے والے اثرات کو مصلحانہ عمل قرار دیتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) لکھتے ہیں:

> قرآن مجید کے ذریعے تطہیر عقائد اور اصلاح اعمال واخلاق کی سب سے طویل، سنجیدہ وعمیق اور موثر ووقیع کوشش خاندان ولی اللّٰہی کے سب سے بڑے فرد اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے کاموں کی تکمیل وتوسیع کی سعادت حاصل کرنے والے بزرگ شاہ عبدالعزیزؒ (۱۲۳۹ھ) کے ذریعہ انجام پائی، جنہوں نے ۶۳-۶۲ سال تک دہلی جیسے مرکزی شہر اور تیرھویں صدی ہجری جیسے اہم زمانہ میں درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا، اس کو خواص وعوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اور اس سے اصلاح عقائد کا جو عظیم الشان کام انجام پایا، ہمارے علم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔[۳۷]

عمل بالحدیث کی جدوجہد

برصغیر میں علم حدیث کی نشرواشاعت کے اصل داعی حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد مضبوط کڑی شاہ

---

[۳۶] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات (حرفے چند)، ص: ۹

[۳۷] تاریخ دعوت وعزیمت، ج: ۵، ص: ۱۵۰

عبدالعزیزؒ کی ہے۔ والد گرامی نے نصوص قرآن وحدیث کی توضیح و تشریح، ان کے مطالب کو عوام میں پھیلانے اور عمل بالحدیث کی ترویج واشاعت کا جو ''شجر طوبی'' لگایا تھا، اس کی آبیاری شاہ عبدالعزیزؒ نے کی اور اسے اس قدر ثمر آور بنادیا کہ آج تک لوگ اس سے خوشہ چینی کر رہے اور دریائے علم کے آب زلال سے اپنی تشنگی بجھارہے ہیں۔[۳۸] مولانا صدیق حسن قنوجیؒ لکھتے ہیں:

ان کا خاندان علوم حدیث اور فقہ حنفی کا خاندان ہے۔ اس علم شریف کی خدمت جیسی کہ اس خاندان سے اس اقلیم میں بن آئی دوسرے کسی خاندان کی بابت معلوم اور مشہور نہیں۔ درحقیقت اس سرزمین میں عمل بالحدیث کی تخم ریزی ان کے والد ماجد نے کی اور انہوں نے اس کو برگ وبار بخشے اور پروان چڑھایا۔[۳۹]

مولانا محمد رحیم بخش دہلویؒ ''حیات ولی'' میں لکھتے ہیں:

درحقیقت عمل بالحدیث کا بیج ہندوستان کی بنجر اور ناقابل زمین میں آپ کے والد بزرگوار جناب شاہ ولی اللہؒ نے بویا اور آپ نے اسے پانی دیتے دیتے یہاں تک پہنچائی کہ اس سے ایک نہایت خوش نما اور نونہال پودا پھوٹا، جو چند روز میں سرسبز وشاداب ہو کر لہلہانے لگا اور پھر تھوڑے ہی عرصہ میں دور دور کے لوگ اس کے پھل وپھول سے گودیاں لبریز کر کے جانے لگے۔[۴۰]

شاہ عبدالعزیزؒ نے ایک طرف درس قرآن کو عام کیا تو وہیں درس حدیث کی محفل آراستہ کر کے لوگوں کی توجہ عمل بالحدیث کی طرف مبذول کرائی۔ علم حدیث پر آپ نے دو اہم اور محققانہ کتاب بھی تصنیف کیں۔ ''بستان المحدثین'' کے ذریعہ ثقہ محدثین اور حفاظ حدیث کی عظمت کو متعارف کرایا اور ان کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا تو ''عجالہ نافعہ'' کے ذریعہ عمل بالحدیث کے اصول تک طالب حدیث کی رسائی کرائی، تاکہ وہ روایت حدیث میں صحیح وضعیف اور موضوع احادیث کا فرق کر سکیں۔

فقہی خدمات میں معتدل نقطۂ نظر

شاہ عبدالعزیزؒ کو دیگر علوم کے ساتھ علوم فقہیہ میں بھی گہری بصیرت تھی۔ فقہی جزئیات وکلیات

---

[۳۸] شاہ عبدالعزیز، عجالۂ نافعہ (مترجم: ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی) مجلس ثقافت ونشریات اسلام، مظفر پور، بہار، ۲۰۱۴ء، ص: ۱۰

[۳۹] اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین، ص: ۲۹۷

[۴۰] محمد رحیم بخش دہلوی، حیات ولی، المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۵۹۵

اور اصول فقہ پر ان کی عمیق نظر تھی۔ ان کا شمار اس عہد کے بڑے فقہا میں ہوتا تھا۔ بہ کثرت عوام فقہی مسائل کے حل کے لئے ان سے ہی مراجعت کرتی تھی۔ وہ ان روایتی مفتیوں کی طرح نہیں تھے جن کی نظریں عصری تقاضوں سے عاری ہوتی ہیں۔ وہ خود حنفی المسلک تھے، مگر دوسرے فقہی مسالک کے تئیں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ جو ان کی اعتدال پسندی کی دلیل ہے۔ ملفوظات میں جابہ جا یہ چیز دیکھنے کو ملتی ہے۔[۴۱] ایک اور موقع سے شاہ صاحب نے فرمایا:

> چاروں اماموں کے چاروں طریقہ بہت خوب ہیں اور ہر ایک کے یہاں اپنے اپنے طریقہ کی رعایت اور حجت موجود ہے۔ چنانچہ امام مالک قراء سبعہ کو جن کو صحابہ کرام سے صحت سند حاصل تھی معتبر سمجھتے تھے اور امام مالک نے کوفی اور عراقی والی احادیث کو ترک فرما کر مدینہ کی روایات اور احادیث کو اپنے لئے معمول بہا بنایا تھا۔ اسی طرح امام شافعی نے تمام حدیثوں کو جمع کیا اور ان میں جن کو مرجح، صحیح اور مستند سمجھا ان کو قابل عمل گردانا، باقی کو ترک فرمادیا اور امام احمد بن حنبل نے ظاہر حدیث پر اپنے عمل کی بنیاد رکھی اور ان کے باہم تعارض کو مقدم و موخر نیز مناسب ترتیب دے کر اس کو رفع کیا۔[۴۲]

شاہ عبدالعزیزؒ کی زندگی کا یہ بھی ایک روشن باب ہے کہ انہوں نے بڑی تعداد میں مسائل فقہیہ کی تخریج کی اور امت مسلمہ کی رہنمائی فرمائی۔ وہ پیش آمدہ عصری مسائل کا حل دل نشیں پیرائے میں اور بڑی بے باکی سے کرتے۔ فتاویٰ عزیزی کے مطالعہ سے ان کی فقہی مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے لئے انگریزی تعلیم کی حمایت کی تھی اور اس کے جواز کا فتوی دیا اور انگریزوں کی نوکری کو جائز ٹھہرایا تھا۔[۴۳] ساتھ ہی انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر ہندوستان کو دارالحرب بھی قرار دیا تھا۔ اس عہد کے تناظر میں اس قسم کے فتویٰ کا صادر ہونا جرأت مندانہ اقدام تھا۔[۴۴]

---

[۴۱] ملفوظات عزیزی، ص: ۲۱۳

[۴۲] ماخذ سابق، ص: ۲۱۲

[۴۳] شاہ عبدالعزیز، فتاوی عزیزی (مترجم: عبدالواحد نولوی غازی پوری) ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی، کراچی، ۱۴۰۸ھ، ص: ۵۹۹- ۶۰۰

[۴۴] ڈاکٹر ثریا ڈار، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، اریب پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص: ۳۱۰

شیعیت ورافضیت کا تعاقب

اورنگ زیب عالم گیر کے انتقال کے بعد شیعوں کا اثر ورسوخ بہت زیادہ بڑھ گیا اور سلطنت کے اہم عہدوں تک وہ رسائی حاصل کر چکے تھے۔ان لوگوں نے بڑی چالاکی سے مغل شہزادوں کو اپنے حصار میں کر لیا اور انہیں اپنا کٹھ پتلی بنالیا تھا۔شیعہ کے اثر ورسوخ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وزیر منعم خاں کے سمجھانے بجھانے سے بہادر شاہ اول(۱۷۱۲-۱۷۰۷ء) نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔[۴۵] سید برادران قطب ملک، عبداللہ خاں اور امیر الامرا حسین علی وغیرہ سلطنت میں بڑے بااثر اور اپنے مذہب میں سخت ومتعصب تھے۔اسی عہد میں تفضیلیت کو بھی پنپنے کا موقع ملا۔[۴۶] ذوالفقار الدولہ نجف خاں امیر الامرا (۱۷۷۲-۱۸۸۳ء) جب تک زندہ رہا، شیعیت کو بہت فروغ ملا۔خود شاہ عبدالعزیزؒ کے کئی رشتہ دار شیعہ مذہب اختیار کر چکے تھے۔اس میں ایک نام قمر الدین منت حسینی کا بھی ہے، جو شاہ صاحب کے تلامذہ میں سے تھا۔[۴۷] شاہ صاحب تحفہ اثنا عشریہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اور جس زمانہ میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس میں اثنا عشریہ کا غلغلہ اور شہرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ بہ مشکل کوئی ایسا گھر ہو گا جس میں کوئی نہ کوئی یہ مذہب اختیار نہ کر چکا ہو، یا اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔لیکن ان میں سے اکثریت چوں کہ اپنے علم تاریخ اور مسائل مذہب سے کوری ہے اور اپنے اسلاف اور بزرگوں کے حالات سے یکسر بے خبر اور غافل ہے۔اس لئے جب اہل سنت کی مجلسوں میں گفتگو کی نوبت آتی ہے تو وہ بے ربط، بے محل اور لایعنی ہوتی ہے۔[۴۸]

شاہ عبدالعزیزؒ تشیع کے افکار و نظریات کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لئے پہلے سے ہی پیش پیش تھے۔ جیسے ہی ان کی کتاب ''تحفہ اثنا عشریہ'' سامنے آئی، ہر طرف ہلچل مچ گئی اور ہر جگہ اس کی بازگشت سنائی دینے لگی اور شیعوں کی نفرت کی چنگاری تیز سے تیز تر ہو گئی۔ حالاں کہ اس کتاب میں

---

[۴۵] محمد ایوب قادری، فضائل صحابہ واہل بیت (مجموعہ رسائل شاہ عبدالعزیز دہلوی) پاک اکیڈمی، وحید آباد، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص: ۱۱

[۴۶] فضائل صحابہ واہل بیت، ص: ۵۷

[۴۷] ملفوظات عزیزی، ص: ۹۲۔ فضائل صحابہ واہل بیت، ص: ۶۳

[۴۸] شاہ عبدالعزیز، تحفہ اثنا عشریہ (مترجم: مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری)، دارالاشاعت، کراچی، اشاعت اول، سنہ ندارد، ص: ۲۱

جارحانہ لب ولہجہ اختیار نہیں کیااور نہ الزامی جواب دینے کی کوشش کی، بلکہ سلجھے ہوئے انداز اور ناصحانہ پیرائے میں مع دلیل تشیع کے خود ساختہ عقائد وافکار کو بے نقاب کیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ نبوت اور خلافت کے معاملے میں اہل تشیع کے جو نظریات ہیں، وہ درست نہیں ہیں۔ مستند شیعی کتب میں اس غلو کی کوئی سند نہیں ملتی۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ خود شیعہ اپنے اصل مذہب پر عمل پیرا نہیں ہیں، پھر کس طرح دوسرے صحیح العقیدہ لوگوں کی تکفیر وتذلیل اور تبرا کو جائز سمجھتے ہیں۔ مولانا سید احمد عروج قادریؒ (۱۹۱۳-۱۹۸۶ء) لکھتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ شیعیت وتفضیلیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو اس دور میں اکابر مشائخ نقشبندیہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ، حضرت شاہ غلام علی نقشبندیؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ وغیر ہم نے بڑی پامردی اور ہمت سے روکا اور ان حضرات کے بعد سب سے زیادہ کوشش اس سلسلہ میں شاہ عبدالعزیزؒ نے کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یہ سیلاب بڑھتے بڑھتے خود ان کے خاندان میں داخل ہو چکا تھا۔ ان کے شاگرد اور رشتہ دار قمر الدین منت شیعہ ہو چکے تھے۔ ان حالات میں شاہ عبدالعزیزؒ نے قلمی جہاد فرمایا۔ اس سلسلہ میں ان کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دو معرکۃ الآرا تصانیف ''ازالۃ الخفا'' اور ''قرۃ العین فی تفضیل الشیخین'' نے مشعل راہ کا کام دیا ہوگا۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنے والد کے مشن کو جاری رکھا اور ''ہر چہ پدر تمام نہ کرد پسر تمام کند'' کے مقولہ کو ثابت کر دکھایا۔[۴۹]

بعض تذکروں' سے پتا چلتا ہے کہ امیر الامرا نجف خاں کو شاہ عبدالعزیزؒ سے سخت پرخاش تھی۔ جیسے ہی تحفہ اثنا عشریہ سامنے آئی وہ ان سے مزید دشمنی کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے ان کے اور ان کے اہل خانہ کے لئے جلاوطنی کا فرمان جاری کروادیا اور ان کی جاگیر کو بھی سلب کرلیا۔ فرمان کے بموجب شاہ عبدالعزیزؒ جون پور چلے گئے اور شاہ رفیع الدینؒ لکھنؤ۔ اتنا لمبا سفر دونوں حضرات کو پیدل ہی کرنا پڑا، کیوں کہ سواری استعمال نہ کرنے کی ہدایت تھی۔ دوران سفر خاص کر شاہ صاحبؒ کو ناقابل برداشت متعدد قسم کی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جلاوطنی کی مدت ختم ہونے کے بعد یہ دلی لوٹ کر آئے۔[۵۰] جاگیر

---

[۴۹] فضائل صحابہ واہل بیت، ص: ۷۰

[۵۰] اشرف علی تھانوی، ارواح ثلٰثہ یعنی حکایات اولیا، مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۹۔ حکیم محمود احمد برکاتی، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۰۲۔ حکیم محمود احمد برکاتی، شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۵۱-۱۵۲۔۔۔۔۔۔۔ شاہ

جو ضبط ہوئی تھی، اسے بعد میں ایک انگریز افسر مسٹر سٹین جوان کی بڑی عزت کرتا تھا، کی توجہ سے واپس لوٹادی گئی۔[۵۱] لیکن اس بات کی بھی کوئی ٹھوس شہادت نہیں ملتی کہ شاہ صاحب کی جاگیر کب، کس وجہ سے اور کس نے ضبط کی تھی؟

فتویٰ ''دارالحرب'' جرأت مندانہ اقدام

شاہ عبدالعزیزؒ کا زمانہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا تھا۔ انہوں نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اتار چڑھاؤ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ مرہٹے، جاٹ، سکھ اور روہیلوں کے بار بار کے حملوں کا بھی مشاہدہ کیا تھا۔ ان کے مظالم کو دیکھ کر وہ خون کے آنسو روتے تھے اور ان سے نجات پانے اور ان کی بربادی کی دعائیں کرتے تھے۔[۵۲] ان لوگوں نے سلطنت دہلی سے بغاوت کر کے خود مختار حکومت بھی قائم کرلی تھی۔ جہاں کفریہ امور علی الاعلان انجام دیئے جاتے تھے، مسجدوں اور خانقاہوں کو روندا اور منہدم کیا جاتا تھا۔ بعض علاقوں میں مسلمانوں کا رہنا بہت مشکل ہو گیا تھا اور وہ بے بس ہو گئے تھے۔[۵۳] تاہم اب بھی یہ ملک اور علاقہ مغلیہ سلطنت کی ماتحتی میں تھا اور گویا اس کا ایک امیر تھا، اگرچہ ان کی سیاسی قوت کو گھن لگ گیا تھا۔ اس کے باوجود اس وقت تک برصغیر شریعت کی رو سے دارالاسلام تھا۔

دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی بہ تدریج اپنے اثرات کو بڑھانے میں لگی ہوئی تھی۔ ۱۷۵۷ء میں پہلے اس نے بنگال کے نواب سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں شکست دے کر کچھ شرطوں کے ساتھ اسے اپنا مطیع بنایا۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کے میدان میں شجاع الدولہ کو شکست دی۔ اس کے بعد اس نے جنوبی ہند کا رخ کیا اور کافی مزاحمت کے بعد ۱۷۹۹ء میں سرنگا پٹنم کے مقام پر ٹیپو سلطان کو شہید کر کے سلطنت خداداد کی مالک بن گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء میں مغل شہزادہ کے تمام اختیارات سلب

عبدالعزیز کے قریبی عہد میں لکھی جانے والی سوانحی کتب اور تذکروں میں اس قسم کے واقعہ کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ بعد کے عہد میں جو کتابیں لکھی گئیں ہیں، ان میں یہی بیان ہوا ہے، لیکن ان میں بھی اصل حوالے موجود نہیں ہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: فضائل صحابہ واہل بیت، ص: ۵۶-۵۵۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ص: ۱۲۲- ۱۳۰)

[۵۱] فضائل صحابہ واہل بیت، ص: ۵۵

[۵۲] مناظر احسن گیلانی، تذکرہ شاہ ولی اللہ، نوید پبلیکیشنز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۲۸

[۵۳] تذکرہ شاہ ولی اللہ، ص: ۳۸-۳۴؛ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص: ۱۹

کر کے دہلی کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔

اب جب کہ برصغیر کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال یکسر بدل گئی اور انگریز یہاں کے مالک کل بن گئے، تو اس کی شرعی حیثیت بھی تبدیل ہو گئی، جس کی وضاحت اس عہد کے تناظر میں ضروری تھی، کیوں کہ اس تبدیلی سے یہاں کے مسلمانوں کو پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کو ایسٹ انڈیا کمپنی یا انگریزوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کا بخوبی اندازہ تھا۔ نیز تبدیلی سلطنت کی وجہ سے خود پڑھے لکھے لوگوں میں بھی یہ بات تشویش کا باعث رہی ہو گی کہ اب ملک کی شرعی حیثیت کیا ہو گی اور ہمارے روزمرہ کے مسائل شریعت کے کس اصول کے تحت حل کئے جائیں گے۔ ان چہ می گوئیوں سے شاہ صاحب بھی باخبر تھے۔ چنانچہ سائل نے مطلق سوال کیا: ''دارالاسلام دارالحرب ہو سکتا ہے کہ نہیں؟'' شاہ صاحب نے عمومی صورت حال کے پیش نظر وسیع تناظر میں برصغیر کو دارالحرب قرار دیا اور ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ظلم وزیادتی اور ناانصافیوں کا بھی ذکر کیا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے در مختار کی طویل عبارت کی روشنی میں بیان کیا کہ کوئی بھی دارالاسلام تین شرطوں کی بناپر دارالحرب بن جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ برصغیر کے وسیع تناظر میں اس کا درج ذیل جواب تحریر کرتے ہیں:

> اس شہر میں مسلمانوں کے امام کا حکم ہرگز جاری نہیں۔ نصاریٰ کے حکام کا حکم بے دغدغہ جاری ہے اور احکام کفر کے جاری ہونے سے یہ مراد ہے کہ مقدمات، انتظام سلطنت اور بندوبست رعایا و تحصیل، خراج اور باج و عشر اموال تجارت میں حکام بطور خود حاکم ہوں اور ڈاکوؤں اور چوروں کی سزا اور رعایا کے باہمی معاملات اور جرموں کی سزا کے مقدمات میں کفار کا حکم جاری ہوا گرچہ بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ و عیدین اور اذان اور گاؤ کشی میں کفار تعرض نہ کریں، لیکن ان چیزوں کا اصل اصول ان کے نزدیک بے فائدہ ہے کیوں کہ مسجدوں کو بے تکلف منہدم کرتے ہیں۔ جب تک یہ اجازت نہ دیں کوئی مسلمان اور کافر ذمی ان اطراف میں نہیں آسکتا۔ مصلحتاً واردین اور مسافرین اور تاجروں سے مخالفت نہیں کرتے۔ دوسرے امر مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم بلااجازت ان کے شہروں میں نہیں آسکتے اور اس شہر سے کلکتہ تک ہر جگہ نصاریٰ کا عمل ہے، البتہ دائیں اور بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ اور رام پور میں ان کا حکم جاری نہیں، کیوں کہ ان مقامات کے والیان ملک نے ان سے صلح کر لی اور ان کی فرماں برداری منظور کر لی۔[۵۴]

شاہ عبدالعزیزؒ کے اس طرح کے دوسرے فتاوے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحکام حکومت کے بعد پیش

---

[۵۴] فتاویٰ عزیزی، ص: ۴۵۳-۴۵۶

آمدہ جدید مسائل کے تناظر میں صادر ہوئے،اس کے بڑے دوررس نتائج پیدا ہوئے۔ خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانوں کو چند خاص چیزوں کا پابند کر دیا اور انہیں غلامی کے طوق سے نجات دلانے کی طرح ڈال دی۔[۵۵] ڈاکٹر سید معین الحق (۱۹۰۱-۱۹۸۹ء) لکھتے ہیں:

شاہ عبدالعزیز کے کارناموں کی اہمیت کا اندازہ ہم ان کے دو اہم تاریخی فتوؤں سے لگا سکتے ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط قائم ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کے لئے انگریزی تعلیم کا مسئلہ بہت اہم ہو گیا تھا۔ عام طور پر اس کو لوگ دین کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن شاہ صاحب نے اس کے جواز میں فیصلہ دیا۔ لیکن جب انگریزی حکام نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اسلامی احکام کی پابندی اور ان پر عمل کرنا مشکل نظر آنے لگا اور یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اسلامی معاشرہ کی حیثیت بہت جلد ختم ہو جائے گی تو آپ نے کمپنی کے زیر حکومت علاقہ کو دارالحرب قرار دے دیا۔ انیسویں صدی کی ربع اول میں یہ جرأت مندانہ فیصلہ معمولی بات نہ تھی۔ تاریخی واقعات کا بغور مطالعہ کرنے سے ان دونوں فتوؤں کے دیر پا اور دوررس نتائج صاف طور پر نظر آجاتے ہیں۔ انگریزی حکومت کے خلاف علما کے جہاد کا سلسلہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ نے جہاد بالقلم اور دوسرے نے جہاد بالسیف کو اختیار کیا۔ پہلے گروہ نے عیسائی مشنریوں کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ تحریر اور تقریر کے ذریعہ کیا اور دوسرے گروہ نے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف کھلے میدان میں جنگ کی اور دین اور قوم کی خاطر شہادت سے سرفراز ہوئے۔[۵۶]

تصنیفی شاہ کار

شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی دیگر اصلاحی خدمات کے ساتھ ساتھ قلم و قرطاس سے بھی مضبوط رشتہ بنائے رکھا اور ان کے نوک قلم سے بڑی وقیع کتابیں اور رسالے عربی اور فارسی زبانوں میں معرض وجود میں آئے، جو شاہ کار کا درجہ رکھتی ہیں اور مشعل راہ بھی ہیں۔ یہ تحریری سرمایہ ان کے علمی تبحر، زبان دانی، ادبیت کی چاشنی، پیرایہ بیان، سلاست و روانی کے ساتھ تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہیں۔ ان کی تمام

---

[۵۵] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ص: ۱۳۰

[۵۶] ملفوظات عزیزی، ص: ۶

کتابیں ترجمہ کے مراحل سے گزر کر اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان میں کم ہی کتابیں ایسی ہیں جسے انہوں نے خود سے لکھا، بصارت سے محرومی کے سبب بیش تر کتابوں کا انہوں نے املا کرایا تھا۔ یہاں اختصار کے ساتھ ان کی چند اہم اور مشہور کتابوں کی قدر و قیمت پر گفتگو کی جائے گی، جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ یہ کتابیں سماجی و معاشرتی اصلاح میں کتنی معین ثابت ہوئیں۔ یوں تو ان کی چھوٹی بڑی کتب کی تعداد کئی درجن تک پہنچتی ہے۔[۵۷]

فتح العزیز/تفسیر عزیزی

شاہ عبدالعزیزؒ نے قرآن مجید کی جو تفسیر فتح العزیز کے نام سے لکھی وہ بڑی مہتم بالشان ہے۔ یہ آسان فارسی زبان میں تحریر کی گئی تھی، اسے شاہ صاحب نے اپنے ایک شاگرد اور مرید شیخ مصدق الدین عبداللہ کی درخواست پر املا کروایا تھا۔ تفسیر مکمل ہے یا نامکمل، اس بارے میں الگ الگ رائے ملتی ہے۔ دستیاب تفسیر کی روشنی میں یہی متفق ہے کہ آخر کے دو پارے اور سورہ فاتحہ وبقرہ کی تفسیر لکھی گئی تھی۔ اس تفسیر کی غیر معمولی اہمیت اور انفرادیت کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں:

> لیکن اس عدم تکمیل کے باوجود اس تفسیر میں بہت سے ایسے نکات و تحقیقات ہیں جو بہت سی مشہور تفاسیر میں نہیں ملتیں، شاہ صاحب کے درس تفسیر اور آپ کی کتاب تفسیر فتح العزیز میں ان مسائل پر خاص طور پر محققانہ کلام کیا گیا ہے، جن کے بارے میں اس وقت کے علمانے تحقیق و صاف بیانی سے کام نہیں لیا تھا، اور اس کی وجہ سے عوام کی ایک بڑی تعداد فساد عقیدہ اور مشرکانہ اعمال تک میں گرفتار تھی، مثلاً آیت: وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تفسیر جو اس کتاب کے خصوصی مقامات میں سے ہے، اسی طرح سحر کی بحث (وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ الخ کے ذیل میں) اور بعض دوسری آیات کے سلسلہ میں تحقیقات نادرہ، اس کتاب کی خصوصیات میں سے ہیں۔[۵۸]

بستان المحدثین

بستان المحدثین بھی بڑی مشہور و مقبول کتاب ہے، جو فارسی زبان میں تحریر کی گئی تھی۔ کب لکھی گئی

---

[۵۷] مقالات طریقت، ص: ۲۴-۳۵

[۵۸] تاریخ دعوت و عزیمت، ج: ۵، ص: ۳۵۷

اور کیا شاہ عبدالعزیزؒ نے اس کو بھی املا کرایا تھا، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس میں شاہ صاحب نے سو سے زائد کتب حدیث کا تعارف پیش کیا ہے اور ان کے مؤلفین کے حالات و واقعات کو کمال احتیاط کے ساتھ اور محققانہ و دل نشیں پیرائے میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا ہے۔ کتاب کی تصنیف کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کے بارے میں خود شاہ صاحب کتاب کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

> چوں کہ اکثر رسالوں اور تصنیفوں میں ایسی کتابوں سے حدیثیں نقل کی جاتی ہیں، جن پر اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے سننے والوں کو حیرانی پیش آتی ہے، اس وجہ سے اصل مقصود تو انہی کتابوں کا ذکر ہے، مگر تبعاً ان کے مصنفین کا بھی ذکر کیا جائے گا، کیوں کہ مصنف سے اس تصنیف کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ نیز ہمارا مقصود فقط متون کا ذکر ہے، مگر بعض شرحوں کا بھی اس وجہ سے ذکر کیا جائے گا کہ کثرت شہرت اور کثرت نقل اور زیادتی اعتماد کی وجہ سے اگر ان کو متون کا حکم دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔[59]

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ تاریخ حدیث اور محدثین کے حالات پر یہ کتاب بڑی وقیع ہے۔ اس کا مطالعہ طالب علم کو دیگر دوسری کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے بعد سے جن مصنفوں نے سلف کی یادگار میں کتابیں لکھی ہیں وہ در حقیقت اسی کے خوشہ چیں ہیں۔[60]

عجالہ نافعہ

رسالہ ''عجالہ نافعہ'' بزبان فارسی علم حدیث اور سند حدیث پر مشتمل ہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اسے اپنے ایک شاگرد مولانا قمر الدین منت حسینی (۱۷۴۶-۱۷۹۴ء) کے استدعا پر سند حدیث عطا کرنے کے تحت لکھا تھا۔ (یہ وہی قمر الدین ہیں جنہوں نے بعد میں شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔) اس میں کل دو فصول ہیں۔ یہ کمیت کے اعتبار سے تو ایک مختصر رسالہ ہے، جو چند صفحات میں ہے، مگر کیفیت کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر عہد میں اس کتاب کی ضرورت محسوس کی گئی۔ حدیث کے طالب علموں کے لئے اصول حدیث اور سند حدیث کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ شاہ

---

[59] شاہ عبدالعزیز، بستان المحدثین (مترجم: عبدالسمیع دیوبندی) مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، مظفر نگر، ۱۴۳۷ھ، ص:۱

[60] محمد رحیم بخش، حیات عزیزی، منبع فیض پریس، دہلی، بار اول، سنہ ندارد، ص: ۲۶-۲۷

عبدالعزیزؒ کتاب کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں: ''اس فن شریف کے تھوڑے سے متعلقات کو اس رسالہ میں بیان کیا گیا ہے، اور بقیہ کو ان کے روشن اور ہوشیار اور ذہین طبیعت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔''[۶۱] اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر کے رہنما (مجموعہ مقالات) کے مرتب محمد خالد مسعود رسالہ ہذا کے مندرجات کی روشنی میں اس کی اہمیت وافادیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مختصر رسالہ عجالہ نافعہ اصول حدیث پر لکھا گیا جس کا مقصد صحیح اور ضعیف حدیث کی پہچان کے طریقے بیان کرنا تھا۔ آپ نے اس رسالے میں متأخرین محدثین پر تنقید بھی کی کہ انہوں نے غیر معتبر کتابوں کی حدیثوں پر انحصار کیا ہے۔ آپ نے درایت حدیث کے اصول بیان کرتے ہوئے بتایا کہ جو حدیث مشہور تاریخی واقعے یا عقل وشرع کے مقتضیات کے مخالف ہو اور ترغیب وترہیب میں مبالغہ آمیز ہو، وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔ وضع حدیث کے اسباب بیان کرتے ہوئے آپ نے وضاحت کی کہ اس میں زیادہ حصہ خلفا اور امرا کے مصاحبین کا ہے جنھوں نے خوشامد کے لئے حدیثیں گھڑیں، پھر زہاد، عباد اور ایسے لوگ بھی اس میں شامل ہیں جنھوں نے نیک نیتی سے حکمت واخلاق کی اچھی باتیں رسول اللہ سے منسوب کردیں۔[۶۲]

فتاویٰ عزیزی

شاہ عبدالعزیزؒ کو فقہ وفتاویٰ کی کتابوں کے کلیات وجزئیات اور اس کی طویل عبارتیں مستحضر تھیں اور وہ فتاویٰ نویسی کے اصول ومبادی سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے فتاوی میں قرآن وحدیث کو ترجیحی مقام حاصل ہے، اس کے بعد ہی وہ فقہی کتابوں کی طرف مراجعت کرتے اور بصائر ونظائر، مصالح مرسلہ، عرف وعادات وغیرہ کی روشنی میں مسائل کا استخراج کرتے تھے۔ مسئلہ کی تفہیم میں آسانی سے کام لیتے تھے۔ ان کی حالات وزمانہ پر نظر تھی، اس کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہی فتویٰ صادر کرتے تھے۔ فتاویٰ کی غیر معمولی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر ثریا ڈار لکھتی ہیں:

> شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مذہبی اور علمی جواہر ریزوں پر مشتمل فارسی تصنیف ''فتاویٰ عزیزی'' کی دو جلدیں آپ کے تبحر علمی کا نچوڑ اور دینی معلومات کا وقیع سرمایہ ہے۔ فقہ وعقائد، تفسیر وتشریح اور تصوف وکلام کے اس مقبول ومعروف دینی وعلمی مجموعے سے ملت اسلامیہ

---

[۶۱] فوائد جامعہ شرح عجالہ نافعہ، ص: ۹۱

[۶۲] اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر کے رہنما، ص: ۳۳۰

کے تمام طبقات کے علما و طلبا اور متلاشیان حق ہر دور میں مستفید ہو سکتے ہیں۔ اہل اسلام آپ کے علمی و مذہبی مقام اور مسلمانان بر صغیر آپ کی دینی و علمی خدمات سے بخوبی واقف ہیں۔ شرعی احکام اور عجیب و غریب مسائل دینیہ کے تحقیقی جوابات پر مشتمل آپ کا یہ بیش بہا علمی خزانہ آپ کے تبحر علمی کا واضح ثبوت ہے۔اس تصنیف میں آپ بہ یک وقت ایک عظیم فقیہ، صوفی، متکلم، مفسر اور محدث دکھائی دیتے ہیں۔ شاہ صاحب اپنے زمانے میں ہمیشہ ہندوستانی مسلمانوں کے درس وتدریس، افتا و فصلِ خصومات اور ان کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے وسیع پیمانے پر سوالوں کے جواب دینا آپ کی تمام علوم ظاہری و باطنی میں کامل مہارت کی ایک پختہ دلیل ہے۔[۶۳]

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ فتاویٰ شاہ عبدالعزیزؒ کے نہیں ہیں، بلکہ کسی اور کے ہیں، جسے ان کے نام سے منسوب کرکے چھاپ دیا گیا ہے۔ شاہ صاحب کے ایک معتبر سوانح نگار نے واضح کیا ہے کہ اس مجموعہ میں شامل چند ایک فتاویٰ کے بارے میں شبہ تو کیا جا سکتا ہے، مگر مکمل کے بارے میں ہر گز نہیں۔[۶۴]

تحفہ اثنا عشریہ

شاہ عبدالعزیز کے گلستان علم و عمل میں ''تحفہ اثنا عشریہ'' کی حیثیت اس پھول کی مانند ہے کہ وقت گزرنے کے بعد بھی مشام جاں کو معطر کرنے والی اس کی خوش بو کا اثر زائل نہیں ہوتا، بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے شاہ صاحب کی کشادگی علم، بسیار مطالعہ، پیرایہ بیان، ادبیت کی چاشنی اور خاص بات یہ کہ ان کے معتدل نقطہ نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب "ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ" کا سراپا مصداق ہے۔ کتاب کی اشاعت کے بعد شاہ صاحب بھی اہل تشیع کے عتاب کا شکار ہوئے تھے۔ اس کی رد میں اہل تشیع کے بڑے بڑے عالموں نے اپنی علمی توانائی صرف کر دی، پھر بھی آج تک اس کا رد تیار نہ کیا جا سکا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے عہد میں سیاسی بساط میں غیر متوقع الٹ پھیر ہو رہی تھی، مسلم دشمن عناصر اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر پورے ملک میں بے اطمینانی پیدا کر رہے تھے، جس کا زور توڑنا ضروری تھا، اور یہ اسی وقت ممکن تھا کہ دونوں فرقوں یعنی شیعہ اور سنی کو افہام و تفہیم کے ذریعے یکجا کیا جائے۔ چنانچہ اس

---

[۶۳] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ص: ۲۶۷

[۶۴] حیات عزیزی، ص: ۵۶

کتاب نے ہم آہنگی کی فضا ہموار کرنے میں سنگ میل کا کام کیا۔ شاہ صاحب کی نیک نیتی رنگ لائی، جس کا نظارہ بڑی حد تک اس وقت دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انگریزوں کے خلاف برصغیر کی ساری مخالف طاقتیں متحد ہوگئی تھیں، مگر قسمت کا فیصلہ لوح ازل میں محفوظ ہو چکا تھا اور غلامی کا طوق یہاں کا مقدر بن چکا تھا، اس لئے وہی ہوا جو ہونا تھا۔ تحفہ کی غیر معمولی اہمیت اور اس کے علمی مقام ومرتبہ کا تعین کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام (۱۹۰۸-۱۹۶۳ء) لکھتے ہیں:

> تحفہ اثنا عشریہ فی الحقیقت ایک معرکۃ الآرا کتاب تھی اور شاہ عبدالعزیزؒ نے اس کی تالیف میں بے حد محنت اور جاں فشانی سے کام لیا۔ اس سے پہلے مختلف شیعہ سنی مسائل پر کتابیں تصنیف ہوئیں۔ خود شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے قرۃ العین فی تفضیل شیخین، ازالۃ الخفا اور بعض رسائل میں ان مسائل سے بحث کی تھی، لیکن ایسی جامع اور مانع کوئی کتاب نہ تھی۔ فی الحقیقت تحفہ اثنا عشریہ شیعہ سنی مسائل کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے...... لیکن چونکہ بیان میں بڑے ایجاز واختصار سے کام لیا گیا ہے، اس لئے مطالب ومعانی اور دلائل وحوالے بے شمار آگئے ہیں۔ کتاب کے جامع ومانع ہونے کے علاوہ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روایات وبیانات کے انتخاب میں اصول حق کو پوری طرح محفوظ رکھا گیا ہے۔ شیعہ مذہب اور خیالات کے بیان میں فقط مستند اور معتبر شیعہ کتب پر انحصار کیا گیا ہے اور تواریخ وتفسیر میں سے فقط انہی چیزوں کو چنا ہے جن پر شیعہ سنی دونوں فریق متفق ہیں۔ کتاب کی زبان اور طرز بیان بھی متین اور مہذبانہ ہے۔[۶۵]

سر الشہادتین

شاہ عبدالعزیزؒ کا یہ مختصر رسالہ عربی زبان میں ہے، جو تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف سے کچھ پہلے لکھا گیا تھا۔ اس میں نواسہ رسول حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کی شہادت کے واقعات کو اتنی صاف گوئی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ بعض سنی حضرات بھی یہ گمان کرنے لگے کہ کہیں شاہ صاحب اہل تشیع سے متاثر تو نہیں ہوگئے ہیں۔ بلکہ انہوں نے اس کتاب کے ذریعے اس غلو کو بے نقاب کیا جو نواسہ رسول کی شہادت کو لے کر سنیوں میں پائے جاتے تھے۔ ساتھ ہی اس میں ان کے فضائل کو بھی اعتدال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ امام حسن اور حسین کی شہادت

---

[۶۵] شیخ محمد اکرام، رود کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۵۹۳

دراصل پیغمبر اسلام کی ہی شہادت ہے اور جو لوگ یزید کی حمایت میں طرح طرح کی دلیلیں گڑھ کر عوام میں پھیلاتے ہیں وہ غلط ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ نواسہ رسول کی شہادت جس درجے کی ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ اس میں شہادت سری وشہادت جہری کے فرق کو بھی واضح کیا گیا ہے۔[۶۶] شاہ صاحب نے اس نقطہ کی بھی وضاحت کی کہ دنیا نے دیکھ لیا کہ شہادت حسنین کے غم سے اللہ کی ہر مخلوق رنجیدہ اور افسردہ تھی۔

ملفوظات عزیزی

شاہ عبدالعزیزؒ کی علمی مجالس کے احوال کو قلم بند کرنے کا کام ان کے اخیر زمانے میں عمل میں آیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ دنوں تک یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اس میں ان باتوں کا بھی ذکر ہے جو اسلام کے شان دار ماضی کی یاد دلاتی ہیں اور اس میں عبرت ونصیحت کا سامان بھی ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کا تنزل کیوں اور کیسے ہوا؟ اس کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ علم صرف قرآن وحدیث کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اصل ہیں، اس کے ساتھ ان گنت وہ علوم وفنون ہیں جن سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے اور جن کا جاننا اور ان میں کمال پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس کے مطالعہ سے خواجہ اجمیری، خواجہ نظام الدین، خواجہ فرید الدین گنج شکر اور بہت سارے دوسرے صوفیائے کرام کے علاوہ نظامی، گنجوی، خسرو، سعدی، رومی، غزالی، رازی، فارابی اور دیگر مفکرین کے بلندی درجات اور دینی وعلمی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے جو اسلامی دنیا کے لئے عظیم سرمایہ تھے۔ انہوں نے فقہائے اسلام اور علماء کرام ومحدثین عظام کی بے لوث علمی خدمات کا بھی اعتراف بلا کسی تفریق وامتیاز کیا ہے۔ بادشاہوں کی عیش وعشرت اور ان کے غیر ذمہ دارانہ عمل کے ساتھ اہل تشیع کی گم راہیوں کی جگہ جگہ وضاحت کی گئی ہے۔ گویا کہ ملفوظات عزیزی معلومات کا خزانہ ہے اور اس میں علم وعمل کے خوش نما رنگ برنگے پھول ہیں، جتنا درکار ہو اس کی خوش بو سے خود کو معطر کر لیا جائے۔ تاہم اس کے بعض مندرجات میں سقم بھی ہے اور بعض واقعات کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، جو شاہ صاحب کی ذات اعلیٰ مرتبت کے منافی ہے۔

---

[۶۶] شاہ عبدالعزیز، سرالشہادتین (ترجمہ وتخریج: ابوالحماد محمد احمد) مکتبہ برکاتیہ، قصور، پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۳-۱۴

ایک شجر جو سایہ دار بن گیا

شاہ عبدالعزیزؒ کا شمار اپنے عہد کی عظیم شخصیتوں میں ہوتا تھا اور ہر کوئی ان سے اپنی نسبت قائم کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ ان کی توجہ اور تربیت سے بیش قیمت لعل و گہر تیار ہوئے۔ جن کی ذات بابرکات دہلی اور اطراف دہلی کے علاوہ اکناف عالم میں بھی مرجع خلائق تھی۔ انہوں نے منصوبہ بند طریقہ سے اور بڑی خاموشی کے ساتھ مسلم سماج میں سرایت کی ہوئی خرابیوں کے ازالہ کی کوشش کی۔ ان کی دینی، علمی و اصلاحی سرگرمیوں کے مطالعہ میں کسی بھی مقام پر جذباتیت کا عنصر نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے مدعا اور لوگوں کے استدعا کی تکمیل بڑے ہی دل نشیں پیرائے میں کرتے کہ ہر کوئی مطمئن ہو جاتا تھا۔

ملفوظات عزیزی کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ کسی اہم موقع سے اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶-۱۸۳۷ء) نے شاہ عبدالعزیزؒ سے جامع مسجد تشریف لانے کی درخواست کی۔ وقت مقررہ پر تشریف لے گئے اور بادشاہ کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ آگیا اور سلام و مصافحہ کے بعد شاہ صاحب سے عرض کیا: ''انتظار کی وجہ سے آپ کا بہت حرج ہوا''۔ آپ نے فرمایا: آپ کی اور خلق خدا کی خاطر اگر کچھ وقت صرف ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر بادشاہ نے آپ سے درخواست کی کہ اپنے بھائی مولانا رفیع الدین کو کہئے کہ نماز کی امامت کریں۔ آپ نے بادشاہ سے فرمایا: جامع مسجد کے امام آپ کے حکم کے تابع دار ہیں، آپ ان کو حکم دیں، وہ ضرور اس کی پیروی کریں گے۔ پھر بادشاہ نے آپ کو اپنے پاس بلایا اور بیٹھنے کی درخواست کی۔ آپ نے علیحدہ بیٹھنے کی معذرت کرلی۔ باوجود اس کے بادشاہ نے اپنے قریب بیٹھایا، تاہم دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ بنا رہا۔[۶۷]

شاہ عبدالعزیزؒ نے لائق و فائق اور ملی ہمدردی سے سرشار شاگردوں کی ایک بڑی تعداد تیار کرلی تھی، جو خود ایک انجمن تھے اور جن کا اپنا ایک الگ حلقہ تھا اور عوام الناس میں وہ بھی معزز تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب کے منصوبے کے مطابق اپنے اپنے ذوق کے اعتبار سے خدمت خلق کا فریضہ انجام دیا اور دین کی خدمت میں مصروف رہے۔ شاہ صاحب کمزور سلطنت کو گرنے سے تو نہ بچا سکے اور یہ ان کے دائرہ کار میں بھی نہیں تھا، مگر ان کے کرنے کا جو اصل کام تھا وہ یہی تھا کہ مسلم معاشرہ میں دین کی روح بیدار کی جائے اور ان کے ایمان و یقین کو مستحکم کیا جائے۔ اس میں آپ بڑی حد تک کامیاب ہوئے

---

[۶۷] ملفوظات عزیزی، ص: ۱۵۔ سید محمد میاں، علمائے ہند کا شان دار ماضی، جمعیۃ پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ج: ۲، ص: ۵۵۲

اور جس کے دور رس نتائج بھی برآمد ہوئے، جو آگے چل کر ایک بڑی دینی تحریک بن کر ابھری جو انگریزوں کے ظلم وجور کے آگے سد سکندری بن گئی۔[۶۸]

آپ کیا گئے پورا عالم سوگوار ہے

شاہ عبدالعزیزؒ ولی اللّٰہی فکر کو دنیا میں متعارف کرانے کے ساتھ درس وتدریس اور تحقیق وتدوین اور معاشرتی اصلاح کے کاموں میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ دین داری، تقوی، راست بازی اور بلندی علم کی وجہ سے ان کی شخصیت بڑی موئثر ہوگئی تھی۔انہوں نے بڑی بے نیازی کی زندگی گزاری۔ کبھی دربار شاہی اور امرا سے رابطہ نہ رکھا۔ یہ لوگ بھی شاہ صاحب کی بڑی عزت کرتے اور ان کی موجودگی کو باعث خیر وبرکت سمجھتے تھے۔ان کو کلکتہ میں کمپنی کے مدرسے کے لئے پیش کش کی گئی کیوں کہ دہلی میں ان کے روزگار کا کوئی مستقل سلسلہ نہ تھا، پھر بھی انہوں نے سادہ زندگی اور علوم اسلامی کی اشاعت کو زیادہ عزیز سمجھا۔[۶۹] مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم حضرات اور انگریز ان کی بہت عزت کرتے تھے اور ان سے گہرے مراسم تھے۔ بعض انگریز افسر تو اپنی مراد کی تکمیل کے لئے ان سے دعا و تعویذ بھی کراتے تھے۔ یہاں تک کہ کئی مواقع پر ان سے علمی استفادے کی بھی شہادت ملتی ہے۔[۷۰] ان کے وعظ وارشاد سے نہ جانے کتنے لوگوں کے دل کو گرمائے اور بڑی تعداد میں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ ایک موقع سے فرمایا: میرے ہاتھوں صدہا ہندو مسلمان ہوئے مگر شیعہ میں صرف دو آدمی۔[۷۱] وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کا بہت خیال رکھتے اور ان کے کام آتے تھے، ہر کسی کی ذات ان سے کسی نہ کسی طرح وابستہ تھی۔[۷۲]

شاہ عبدالعزیزؒ پر آخر عمر میں بیماری کا شدید حملہ اور نقاہت کا غلبہ ہو گیا تھا، لیکن افادہ عام کا سلسلہ بہ دستور جاری تھا۔اسی حالت میں ۵؍جون ۱۸۲۳ء/۷؍شوال یکشنبہ ۱۲۳۹ھ کو رشد و ہدایت کا یہ چراغ گل ہوگیا۔ مرنے سے قبل وصیت کی تھی کہ ہمارے کفن کا کپڑا وہی ہو جو زندگی میں زیب تن کرتا تھا،

---

[۶۸] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص:۵۶

[۶۹] رود کوثر، ص:۵۸۸

[۷۰] ملفوظات عزیزی، ص:۲۱۴-۲۱۵

[۷۱] ماخذ سابق، ص:۷۰

[۷۲] تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۵، ص:۳۵۱

نیز ہماری نماز جنازہ شہر سے باہر ادا کی جائے اور بادشاہ اس میں شرکت نہ کریں۔ چنانچہ ترکمان گیٹ کے باہر پہلی نماز جنازہ ان کے نواسے شاہ اسحٰق نے پڑھائی۔ بعد ازاں نصیر الدین صاحب لکھنوی شافعی کے مقبرے میں نماز جنازہ ہوتی رہی اور کل ۵۵ بار نماز جنازہ پڑھی گئی، جب کہ غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنے کا الگ سلسلہ جاری تھا۔[۷۳]

تینوں بھائیوں کا حین حیات میں ہی انتقال ہو گیا تھا، صرف تین صاحب زادیاں تھیں، وہ بھی ان سے پہلے فوت کر گئیں۔

خلاصۂ بحث

شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمات جلیلہ کے مطالعے سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پوری زندگی اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کی اور رشد و ہدایت کا چراغ روشن کیا، جس کے خوش گوار اثرات نہ صرف برصغیر میں مرتب ہوئے بلکہ دوسرے ممالک میں بھی یہ فیض عام ہوا۔ طالبان علوم نبوت کی کثیر تعداد ہے، جنہیں شاہ صاحب سے نسبت رہی۔ نیز انہوں نے سماج و معاشرہ میں پھیلی ہوئی گم راہیوں کی اصلاح کے لئے بھی بڑی جدوجہد کی اور اپنے شاگردوں کی بھی اسی انداز سے تربیت کی، تاکہ وہ مستقبل کے لئے واضح نشان راہ فراہم کریں۔ تحریک سید اسماعیل شہید و سید احمد شہید اس کی واضح مثال ہے۔

شاہ عبدالعزیزؒ جدید علوم و فنون کی اہمیت اور انگریزی تعلیم کی افادیت سے نابلد نہیں تھے۔ شاہ رفیع الدینؒ کی ریاضی دانی کے متعلق ایک موقع سے فرمایا: فن ریاضی میں مولوی رفیع الدینؒ جیسا فاضل ہندوستان و بیرون ہندوستان میں کوئی نہیں ہے۔[۷۴] خود شاہ صاحب کو اس فن کا گہرا علم تھا۔ علم جغرافیہ میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ ایک انگریز افسر فریزر نے ان سے کابل کا راستہ معلوم کیا تو آپ نے ٹھیک ٹھیک بتادیا۔[۷۵] کرۂ ارض اور نظام شمسی میں باعتبار موسم جو تغیر ہوتا ہے، اس کی حقیقت سے بھی واقف تھے۔[۷۶] سیٹن ایک انگریز افسر تھا، اس نے شاہ صاحب

---

[۷۳] مقالات طریقت، ص: ۸۶

[۷۴] ملفوظات عزیزی، ص: ۱۲۸

[۷۵] نواب مبارک علی میرٹھی، کمالات عزیزی، مشمولہ بہ طور ضمیمہ ملفوظات عزیزی، ص: ۲۴۹

[۷۶] ملفوظات عزیزی، ص: ۱۷۰

سے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ان دنوں شہر کے کنوئیں کا پانی کہیں کہیں میٹھا ہو گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا تعلق علم سائنس سے تھا۔ مگر شاہ صاحب نے اس کا جو جواب دیا، اس سے وہ لاجواب ہو گیا۔[۷۷] ایک انگریز جہاز راں نے شاہ صاحب سے جہاز رانی سے متعلق کچھ سوالات کئے، شاہ صاحب نے اپنے جواب سے اسے مطمئن کر دیا، ساتھ ہی جہاز کے بعض پرزوں کے حالات بھی بیان کر دیے، جس کے بارے میں وہ خود نہیں جانتا تھا۔ شاہ صاحب نے کہا: بچپن میں اس فن کی ایک کتاب دیکھی تھی، اس میں سے کچھ یاد ہو گیا۔[۷۸] ان خوبیوں اور عظیم مفکر کا درجہ رکھنے کے لیے انہوں نے جدید تقاضوں کے پیش نظر متذکرہ علوم وفنون کو عام کرنے کے لیے کیا کوشش کی، اس کا پتا نہیں چلتا۔ اگر وہ اس جانب توجہ مبذول کرتے تو شاید بعد کے عہد میں مسلمانوں کے لئے جدید علوم وفنون اور انگریزی تعلیم کو اپنانے میں مزاحمت کا سامنا کرنا نہ پڑتا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ شاہ صاحب کے فتویٰ دارالحرب یا بعض دوسرے فتاوے جو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ تھے، اس کی توضیح وتشریح بعد کے ادوار میں متفرق جماعتوں نے الگ الگ زاویے سے کی اور اپنے مدعا کو تقویت دینے کے لیے اسے بہ طور دلیل پیش کیا۔[۷۹]

یہاں یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ کی مصلحانہ کوششوں کے باوجود برصغیر کا مسلم معاشرہ اسلامی معاشرت کی صفت سے متصف کیوں نہ ہو سکا؟ اس کا جواب خود برصغیر کی معاشرتی تاریخ میں موجود ہے اور جو واضح بھی ہے۔ دوسری بات یہ بھی تھی، جس کی طرف مرزا حیرت دہلوی متوجہ کراتے ہیں: ''شاہ عبدالعزیزؒ کے علم وفضل کا سکہ گو دہلی کے ہر فرد بشر پر بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس کا یہ اثر نہ تھا کہ جو بدعتیں ملاؤں کے کہنے سے عوام الناس اور عمائدین شہر کرتے تھے، ان میں کچھ کمی آتی۔''[۸۰] مزید برآں برصغیر کے تکثیری سماج میں کسی بڑی تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کیوں کہ یہاں کی دونوں قومیں ہمیشہ احساس کم تری کا شکار رہی ہیں، اگرچہ آزادی ہند کے بعد اس کی نوعیت بدل

---

[۷۷] ماخذ سابق، ص: ۲۱۵

[۷۸] ارواح ثلٰثہ یعنی حکایات اولیا، ص: ۴۰

[۷۹] محمد خالد مسعو (مرتب) اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں اسلامی فکر کے رہنما (مجموعہ مقالات)، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی یونیورسٹی، پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۴۱ اور ۳۴۹

[۸۰] مرزا حیرت دہلوی، حیات طیبہ (سوانح مولانا سید اسمٰعیل شہید) اسلامی اکادمی، اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص: ۲۳

گئی اور یہ مسلمانوں کے ساتھ خاص ہوگئی۔ یہاں طویل مدت تک مسلمانوں کی حکم رانی رہی ہے۔ پھر بھی مسلمان یہی سمجھتے رہے کہ برادران وطن اکثریت میں ہیں۔ان کے ساتھ میل جول، لین دین وغیرہ کے ساتھ ان کے معتقدات کا احترام اور بعض وقت ان کی دل جوئی ایک ضروری امر تھا۔اس فراخ دلی کی وجہ سے بہت سے غیر اسلامی رسوم وروایات اور معتقدات مسلم معاشرے میں سرایت کر گئے اور مسلمانوں کے اذہان و قلوب پر چھا گئے۔اس کے برعکس غیر مسلم بھی یہی سمجھتے رہے گو کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں، مگر حکومت مسلمانوں کی ہے۔اس لیے وہ بھی بعض چیزوں کے پابند تھے۔اس پس منظر کو پیش نظر رکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شبانہ روز کی فکری واصلاحی مساعی کے نتیجے میں غیر اسلامی رسوم وروایات کو مسلم معاشرے میں پنپنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، بلکہ ایک طرح سے ان کی سر گرمیوں نے تطہیر کا کام کیا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) کے یہ قول: ''اب بھی یہاں دین سے غفلت روز افزوں تھی، مگر آنکھوں میں حیا اور دل میں گداز باقی تھا اور فسق وفجور میں ترقی تھی، مگر فسق وفجور پر اصرار اور معاصی و محرمات کے اظہار واعلان کا رواج نہیں ہوا تھا'' نیز ''اللہ کے نام کا ادب اور اس کی کہلانے والی چیزوں (شعائر اللہ) کا احترام رخصت نہیں ہوا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ توبہ وانابت کی توفیق سلب نہیں ہوئی تھی''۔[۸۱]

تفسیر فتح العزیز، بستان المحدثین اور عجالہ نافعہ بڑی اہم اور محققانہ کتابیں ہیں، جن کے مکمل اور نامکمل ہونے کی بحث میں اختلاف پایا جاتا ہے، نیز فتاویٰ عزیزی اور ملفوظات عزیزی جو بیش قیمت علمی اثاثہ ہیں، ان کے بعض مندرجات میں سقم پایا جاتا ہے جس سے شاہ صاحب کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان علمی جواہر پاروں کی از سر نو تحقیق و تخریج اور تبویب واشاعت کی جائے۔ علمی ورثے کی حفاظت قومی وملی فریضہ اور جو ایک بڑی دینی وعلمی خدمت بھی ہے۔

---

[۸۱] سید ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید (مقدمہ: سید سلیمان ندوی) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۱۱ء، ج: ۱، ص: ۷۸-۷۹۔

اموی عہد میں مختلف مذاہب
کے درمیان رواداری اور بقائے باہم

ڈاکٹر محمد عرفان احمد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

irfan@manuu.edu.in

امن وامان کا قیام اسلام کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہے جسے وہ انفرادی اور اجتماعی ماحول میں بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ اللہ کی مقدس کتاب قرآن مجید کی تعلیمات اور پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی سیرت میں اس کے شواہد موجود ہیں۔ قرآن مجید اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات نے دنیا میں امن واماں اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اور مسلمانوں کو اپنی شریعت پر مکمل طور پر عمل پیرا ہونے کے باوجود دنیا کے دیگر اقوام کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لئے آمادہ کیا اور مختلف عقائد ورسوم ورواج کے پیروکاروں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوت پیدا کی، جس سے رواداری اور بقائے باہم کی عام فضا کی راہ ہموار ہوئی۔

امن وسلامتی اور رواداری کے اس گراں قدر سرمایہ کو آپ ﷺ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین اور اموی خلفاء نے باقی رکھا۔ بنوامیہ کا دور حکومت ۶۶۱-۷۵۰ء تھا۔ اس دورانیہ میں ۱۴ حکمراں گزرے۔ ان کی حکمرانی ایشیا، یورپ اور افریقہ کے بڑے خطے پر مشتمل تھی، جن میں مسلمانوں کے علاوہ عیسائی، یہودی، مجوسی، صابئی، ہندو، بدھ اور جین مذہب کے ماننے والے آباد تھے۔ ان تمام مذاہب کے پیروکاروں کو ہر قسم کی شہری، شخصی، اجتماعی، سیاسی اور مذہبی حقوق حاصل تھے۔ یہ تعددی معاشرہ رنگ ونسل، زبان وعلاقہ اور مذہب وملت کے تمام تر تنوع کے باوجود آپسی معاشرت اور باہمی اخوت و محبت کے اعتبار سے ایک مثالی معاشرہ تھا۔

اس تعددی معاشرے میں امن واماں، آپسی اخوت ومحبت اور بھائی چارگی کو مستحکم کرنے اور اس کی ترویج واشاعت میں اموی حکمرانوں کا اہم رول ہے۔ ان میں امیر معاویہ، عبدالملک بن مروان، ولید بن

عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز اور ہشام بن عبدالملک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے رواداری کی بہترین روایات قائم کیں، غیر مسلموں کے حقوق کے تحفظ کا پورا انتظام کیا، انہیں اہم عہدوں اور مناصب پر فائز کیا، اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دی اور انہیں اپنے مقدمات کے فیصلے اپنے مذہب کے مطابق کرنے کا اختیار دیا۔ اس کی متعدد مثالیں کتب تواریخ میں درج ہیں، جو مسلم حکومتوں میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کے معاملات کو ظاہر کرتی ہیں۔

اموی حکومت کے زیر سایہ آباد غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا گیا اور ان کو بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دی گئی، ساتھ ہی ان سے خوشگوار تعلقات کے قیام کی کوشش کی گئی، ہمسایہ معاہدین کے ساتھ بلا تفریق مذہب وملت حسن سلوک کا مظاہرہ کیا گیا، اور ان کے تئیں روادارانہ وامن پسندانہ پالیسی اختیار کی گئی۔

اموی حکومت کے پہلے حکمراں امیر معاویہؓ اپنے عہد میں نہ صرف یہ کہ خود معاہدوں کی پاسداری کرتے تھے بلکہ ان کے عمال وافسران بھی معاہدوں کی پابندی کا اہتمام کرتے تھے۔ اس تعلق سے مشہور مورخ بلاذری نے تحریر کیا ہے:

> ایک مسجد جو عہد عمر فاروقؓ میں یوحنا کے گرجے کے ساتھ تعمیر کی گئی تھی، امیر معاویہ نے اسے وسیع کرنے کی غرض سے گرجا کی زمین اس میں شامل کرنا چاہا، لیکن عیسائیوں کی عدم رضا مندی کی وجہ سے آپ نے ارادہ ترک کر دیا۔[1]

اس واقعے سے واضح ہوتا ہے کہ امیر معاویہؓ نے اقتدار وحکومت کے باوجود مسجد کی توسیع کی غرض سے زمین کی حصولیابی کے لیے انصاف پسند طرز عمل کو اختیار کیا اور انہوں نے عیسائی عبادت گاہ کے حقوق کی بجاآوری کی وجہ سے مسجد کی توسیع کے لیے گرجا کی زمین کو زبردستی حاصل نہیں کیا۔ اس طرح کی مذہبی رواداری اور حسن معاشرت کا ذکر کرتے ہوئے فلپ کے حِتّی نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ اُڈیسہ کے مقام پر زلزلے کی وجہ سے ایک گرجا گھر گر گیا، جسے امیر معاویہ نے از سر نو تعمیر کروایا[2]۔

امیر معاویہ کے دور حکومت میں مذہبی اور اجتماعی حقوق کے ساتھ ہی انفرادی اور مالی حقوق کی پاسداری بھی کی جاتی تھی۔ چنانچہ آپ کے عہد میں مصر کے گورنر عقبہ بن نافع کو تھوڑی سی زمین کی

---

[1] احمد بن یحیی بن جابر بلاذری، فتوح البلدان، ترجمہ: سید ابوالخیر مودودی، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۱

[2] فلپ کے حتی، تاریخ شام، (ترجمہ: غلام رسول مہر) شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۳۵۲

ضرورت پیش آئی اور انہوں نے امیر معاویہؓ کی اجازت سے ایک عام زمین جو کسی کے قبضہ میں نہ تھی منتخب کرلی۔ گورنر کا یہ انتخاب ان کے ملازم کو پسند نہیں آیا اور اس نے عمدہ قطعہ زمین پسند کرنے کا مشورہ دیا۔، ملازم کا یہ مشورہ ذمیوں کے ساتھ ہوئے معاہدہ کے خلاف تھا، چنانچہ گورنر نے اسے رد کردیا اور کہا کہ ہم ایسا نہیں کرسکتے کیونکہ ذمیوں سے جو معاہدہ ہوا ہے اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان کی زمین ان کے قبضہ سے نہ نکالی جائے[۳]۔اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اموی حکمرانوں کے افسران بھی غیر مسلموں کے حقوق کی پاسداری کے لیے اعلی اور عمدہ چیزوں کو ترک کردیا کرتے تھے اور خود اپنے لیے بھی دستیاب چیزوں پر قناعت کرتے تھے تاکہ غیر مسلموں کے سماجی، مذہبی اور مالی حقوق مکمل طور پر محفوظ رہیں۔

مسلمان حکمرانوں کے غیر مسلم اقوام سے حسن سلوک اور معاہدوں کا احترام اور پاسداری کا ہی نتیجہ تھا کہ غیر مسلم رعایا اور ملحقہ ریاستوں کے حکمراں و سرداران قبائل مسلمانوں پر بے انتہا اعتبار و اعتماد کرتے تھے اور انہیں اپنے حقوق کا محافظ سمجھ کر اپنے آپسی مذہبی تنازعات کے لئے بھی انھیں کی طرف رجوع کرتے تھے۔عیسائی کے دو مشہور مذہبی گروہ ''مارونی'' اور ''یعقوبی'' اپنے مذہبی تنازعات کا حل اپنے مذہبی رہنماؤں کے بجائے اکثر و بیشتر امیر معاویہ سے کرواتے تھے۔امیر معاویہ پر ان کا اعتبار بے جا نہ تھا۔کیونکہ ایک منصف مسلم حکمراں کی حیثیت سے امیر معاویہ کی شخصیت اس امر کی متقاضی تھی کہ مذہبی معاملات جیسے حساس امور میں بھی ان پر اعتبار کیا جاسکے[۴]۔

تعددی معاشرے میں باہمی اخوت و محبت اور یقین و اعتماد اس امر کا متقاضی ہے کہ جس طرح مسلم حکمرانوں پر غیر مسلم رعایا کامل اعتماد کرتے تھے، اسی طرح مسلم حکمراں بھی غیر مسلموں پر کامل اعتماد و یقین کریں اور بلا تفریق مذہب و ملت ہر سطح پر اس کا مظاہرہ کریں۔تاریخی حقائق اور دستاویزات اس خوشگوار رشتہ کی بہترین عکاسی کرتی ہیں، جن میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر غیر مسلموں کی تقرری قابل ذکر ہے۔

اموی خلفانے غیر مسلموں کی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے استفادہ کرنے میں کبھی تعصب سے کام نہیں لیا اور انہیں بھی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز کیا۔چنانچہ امیر معاویہ اپنے دور حکومت میں

---

[۳] شاہ معین الدین احمد ندوی، تاریخ اسلام، فیصل انٹرنیشنل، دہلی، ۲۰۰۶ء، حصہ دوم، ص ۳۴۳

[۴] فلپ کے حتی، تاریخ شام، ص ۳۵۲

غیر مسلموں کی بڑی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے منصور بن سرجون نامی عیسائی کو مالی انتظامات کی ذمہ داری سونپی۔ ایک مسیحی طبیب ابن آثال کو ذاتی معالج کی حیثیت سے مقرر کیا اور اپنا مترجم بھی بنایا[۵]۔ یوحنا دمشقی اموی دور کا ایک ممتاز عیسائی عالم تھا، جو امیر معاویہ اور ان کے بیٹے یزید کا ہم عصر تھا، اور وہ دمشق کا عامل (گورنر) بھی تھا۔ وہ اس منصب پر خلیفہ ہشام کے زمانے تک فائز رہا[۶]۔ اس کے علاوہ امیر معاویہ کا درباری شاعر اخطل، جو معروف عیسائی قبیلے بنو تغلب سے تعلق رکھتا تھا، مسلسل اموی حکمرانوں سے وابستہ رہا۔ اسے دربار میں اس بات کی پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ جس وقت چاہے بلا روک ٹوک خلیفہ کے پاس آ جا سکتا تھا، چنانچہ وہ عبدالملک کے پاس دن یا رات جس وقت اس کا دل چاہتا چلا آتا۔ سنہری چین کے ساتھ گلے میں تعویذ نما صلیب لٹکائے ہوئے اپنی مذہبی شناخت کی وجہ سے کبھی اسے روکا نہیں گیا[۷]۔ یزید کے بیٹے خالد نے طب اور کیمیا سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے عیسائی طبیبوں کی شاگردی اختیار کی اور مریانس نامی ایک راہب عالم سے علم کیمیا سیکھا۔ قدیس یوحنا دمشقی کا باپ خلیفہ عبدالملک کا مشیر تھا۔ عبد الملک نے اپنے چھوٹے بھائی عبدالعزیز بن مروان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اس دور کے مشہور نصرانی عالم اناناسیوس کو دی اور عبد العزیز بن مروان جب مصر کے گورنر بنے تو ان کا عیسائی استاد بھی اپنے شاگردوں کے ہمراہ مصر چلا گیا[۸]۔ عبد الملک کے دور حکومت میں عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے بھی ماہر عیسائی طبیب تیاذوق کی خدمات حاصل کیں اور اسے درباری طبیب مقرر کیا۔ اس نے تیاذوق کے یہودی شاگرد فرات بن شحاثا کی خدمات بھی حاصل کیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم حکمرانوں نے مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیشہ اہل ترین افراد کا انتخاب کیا اور مذہب و عقیدہ کا لحاظ نہیں رکھا، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ غیر مسلم ماہرین علم و فن نے بھی اپنے قدر شناسوں کو مایوس نہیں کیا اور ان کے ساتھ مخلصانہ رویہ اختیار کیا۔

تاریخ میں اس طرح کے متعدد شواہد موجود ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اموی دور میں مسلم

---

[۵] ڈاکٹر مصطفی السباعی، اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو، مترجم: سید معروف شیرازی، ادارہ معارف اسلامی کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۰

[۶] ٹی ڈبلیو آرنلڈ، دعوت اسلام (مترجم: شیخ عنایت اللہ) محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور، ص ۷۷

[۷] ڈاکٹر مصطفی السباعی، اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو، ص ۱۲۲

[۸] ٹی ڈبلیو آرنلڈ، دعوت اسلام، ص ۶۷

حکمرانوں اور غیر مسلموں کے مابین اچھے اور پر اعتماد تعلقات قائم تھے اور اسے امیر معاویہ کے بعد بھی دیگر اموی خلفا نے جاری رکھا، جن کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

مروان بن حکم نے اپنے دور حکومت میں متعدد عیسائیوں کو مختلف عہدوں پر فائز کیا۔ چنانچہ مروان بن حکم نے ایک عیسائی اثاناسیوس کو ایک دوسرے عیسائی کے ساتھ جس کا نام اسحاق تھا، مصر میں حکومت کے بعض عہدوں پر مقرر کیا، بعد میں وہ ترقی کرتے کرتے رئیس الدیوان کے اونچے عہدے پر فائز ہو گیا اور باغات کا مالک ہو گیا۔ اس کے پاس اس قدر سونا تھا کہ اس کا کوئی حساب ہی نہ تھا۔ اس نے الرھا میں ایک کنیسہ تعمیر کرایا، اور اس کنیسہ کی تعمیر میں اپنی چار سو دکانوں سے حاصل ہونے والی دولت کا استعمال کیا[۹]۔ اثاناسیوس نے یہ گرجا اپنے آبائی شہر میں تعمیر کرایا تھا اور اسے حضرت مریم سے منسوب کیا تھا۔ اس گرجا میں ایک علیحدہ عمارت بپتسمہ یعنی اصطباغِ دینے کے لئے بھی تعمیر کروایا تھا، اس میں حضرت مسیح کی تصویر رکھی جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ شاہ ابجر کو بھیجی گئی تھی۔ اس نے فسطاط میں بھی دو عظیم الشان گرجے بنائے اور مصر کے دوسرے شہروں میں بھی گرجے اور راہبوں کے لئے خانقاہیں تعمیر کیں۔

والی مصر عبدالعزیز بن مروان کی ملازمت میں چند عیسائی حاجب (سکریٹری) تھے۔ انہوں نے حکومت کی اجازت سے شہر حلوان میں ایک گرجا ''قدیس یوحنا'' کے نام سے تعمیر کرایا۔ اسی طرح ولید کے دور حکومت میں بھی اس کی اجازت سے ۷۱۱ء میں یعقوبی فرقہ کا ایک گرجا شہر انطاکیہ میں تعمیر ہوا۔ ولید کے بعد یزید ثانی کے عہد حکومت میں بھی انطاکیہ میں کئی گرجے تعمیر ہوئے اور مکمل تزک و احتشام سے ان کا افتتاح بھی ہوا۔ ان میں یعقوبی اسقف ''مار الیاس'' کا تعمیر کردہ گرجا کافی اہم ہے، اس کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد یعقوبی اسقف نے بہت سے پادریوں اور راہبوں کے ہمراہ بڑے وقار کے ساتھ اس کا افتتاح کیا۔ دوسرے دن اس نے ضلع انطاکیہ کے ایک گاؤں سرمدہ میں ایک اور گرجے کا افتتاح کیا[۱۰]۔

ان تاریخی شہادتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اموی عہد میں غیر مسلموں پر اموی حکمراں غیر معمولی اعتماد کیا کرتے تھے اور ان کی قدر شناسی میں کسی طرح کے تعصب سے کام نہیں لیتے تھے اور حکومتی نظم و نسق کو بہتر اور فعال بنانے میں ان کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرتے تھے اور اس غرض سے

---

[۹] ماخذ سابق، ص ۶۷، ۷۰

[۱۰] ماخذ سابق، ص ۷۰

انہیں اعلی سرکاری عہدوں پر فائز بھی کرتے تھے۔ نیز اس دور حکومت میں غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی اور انہیں اپنے مذہبی عقائد و نظریات کے اعتبار سے عبادت گاہوں کی تعمیر و ترقی کا حق حاصل تھا جسے وہ پوری آزادی کے ساتھ بروئے کار لاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس دور میں غیر مسلم عوام کو شخصی، سماجی، مذہبی اور تجارتی حقوق حاصل تھے اور ان کے ساتھ عدل و انصاف کا رویہ اپنایا جاتا تھا اور ان کی خیر خواہی کو یقینی بنایا جاتا تھا۔ عوامی اور حکومتی ہر دو سطح پر ان کے ساتھ رواداری کا معاملہ کیا جاتا تھا جس کی متعدد مثالیں تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں۔ ان میں چند یہ ہیں:

حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور حکومت میں حیرہ کے ایک مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کر دیا۔ عمر بن عبد العزیز نے حیرہ کے حاکم کو لکھا کہ قاتل کو فوراً مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دو، وہ چاہیں تو قتل کر دیں یا معاف کر دیں، چنانچہ ان کے اس حکم پر قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا گیا۔ مقتول کے ورثاء نے حق قصاص کا استعمال کرتے ہوئے اسے قتل کر دیا[۱۱]۔

عدل و انصاف کے ساتھ عمر بن عبد العزیز غیر مسلموں کے حقوق کی پاسداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا بھی حکم دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عامل عدی بن ارطاۃ کو لکھا کہ اپنے علاقے کے ذمیوں کے حالات معلوم کرو، ان کے ساتھ نرمی برتو، ان میں جو بوڑھا اور نادار ہو جائے اس کی کفالت کا انتظام کرو، اگر اس کا کوئی صاحب ثروت رشتہ دار ہو تو اسے اس کی کفالت کا حکم دو، ورنہ بیت المال سے ان کے گزارے کے لئے وظیفہ مقرر کر دو[۱۲]۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کے عدل و انصاف کے تعلق سے ابن کثیر نے تحریر کیا ہے کہ حمص کے ایک ذمی نے ان کی مجلس میں عباس بن ولید بن عبد الملک پر اپنی زمین غصب کر لینے کا مقدمہ درج کیا اور درخواست کی کہ اس کا فیصلہ اللہ کی کتاب کے مطابق ہو۔ عمر بن عبد العزیز نے عباس بن ولید سے اس بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ زمین امیر المؤمنین ولید بن عبد الملک نے انہیں دی تھی اور اس کے ساتھ ہی اپنی طرف سے اس کی ملکیت کا تحریری دستاویز بھی دیا تھا۔ عمر بن عبد العزیز نے معاملے کی تحقیق کے بعد متعلقہ زمین اس ذمی کو واپس دلوا دی[۱۳]۔

عدل و انصاف اور حسن سلوک کے ساتھ ہی عمر بن عبد العزیز غیر مسلموں کے عائلی قوانین کے

---

[۱۱] عبد اللہ بن یوسف الزیلعی، نصب الرایۃ، مکتبہ حقانیہ پیشاور، جلد ۵، ص ۹۰

[۱۲] شاہ معین الدین احمد ندوی، تاریخ اسلام، حصہ دوم، ص ۴۶۳

[۱۳] حافظ ابن کثیر، البدایہ والنھایہ، مکتبۃ المعارف، بیروت، لبنان، ۱۹۹۰ء، ج ۹، ص ۲۱۳

تحفظ کا بھی اہتمام کیا کرتے تھے۔اس حوالے سے آپ کا ایک استفسار تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ آپ نے حضرت حسن بصری سے پوچھا: کیا بات ہے کہ خلفائے راشدین نے ذمیوں کو محرمات کے ساتھ نکاح، شراب اور خنزیر کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دیا تھا؟ حسن بصری نے جواب دیا: انہوں نے جزیہ دینا اسی وجہ سے تو قبول کیا ہے کہ انہیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دی جائے، آپ کا کام انہیں کے نقش قدم کی پیروی کرنا ہے اور اپنی طرف سے کوئی نئی بات ایجاد نہیں کرنی ہے"[۱۴]۔

حضرت حسن بصری کی نصیحت سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کی پاسداری کرنا خلفائے راشدین کا عمل رہا ہے جس کی حفاظت مسلم خلفا پر لازم ہے۔یہی وجہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے غیر مسلموں کے مذہبی حقوق جو گزشتہ خلفا کے زمانے میں سلب ہو گئے تھے،انہیں واپس دلائے،ان میں دمشق کا ایک گرجا بھی ہے جو ایک عرصہ سے ایک مسلمان خاندان کی جاگیر میں چلا آرہا تھا۔عیسائیوں نے عمر بن عبدالعزیز کے پاس دعوی کیا تو آپ نے گرجا انھیں واپس دلادیا اور فرمایا: اگر یہ عیسائیوں کے معاہدے میں ہے، تو تم اسے نہیں پا سکتے[۱۵]۔

غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک غیر مسلم نے خلیفۂ وقت ہشام بن عبدالملک کے خلاف قاضی کے پاس مقدمہ درج کرایا۔ قاضی نے خلیفہ ہشام کو اپنی عدالت میں طلب کر لیا۔اس مقدمہ میں غیر مسلم کا مدعا ثابت ہو گیا اور قاضی نے خلیفۂ وقت کے خلاف اس غیر مسلم کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

مسلم حکمراں اور غیر مسلموں کے تعلقات صرف عرب ممالک تک ہی محصور نہ تھے، بلکہ مسلم فاتحین جہاں بھی گئے وہاں انہوں نے اپنی انصاف پسندی، رعایا پروری اور حسن سلوک کے رواج کو عام کیا جس کی وجہ سے ان کے تعلقات غیر مسلموں سے انتہائی خوشگوار رہے اور معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا فروغ ہوا اور پورا معاشرہ آپسی رواداری اور بقائے باہم کا ترجمان نظر آنے لگا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں مسلم فاتحین نے جن غیر عرب ممالک کو فتح کیا ان میں اندلس اور سندھ کا ذکر ناگزیر ہے۔اندلس میں ابتدا سے ہی مسلم حکمرانوں نے اخوت ومحبت اور آپسی بھائی چارگی کو رواج

---

[۱۴] شمس الدین سرخسی، المبسوط، دار المعرفہ، بیروت، لبنان، ج۵، ص ۳۹

[۱۵] احمد بن یحی بن جابر (بلاذری) فتوح البلدان، ص ۱۹۰۔

دیا۔اس حوالے سے ابتدائی حکمرانوں میں موسی بن نصیر کے صاحبزادے عبدالعزیز کا نام لیناضروری ہے۔انھوں نے اندلس میں جنگ وجدال کے ہیبت ناک اثرات کو ختم کیااور ملک میں امن وسلامتی کا ماحول پیدا کیا اور رعایا کی دلجوئی کے لیے اقدامات کیے اور عوام کو مذہبی آزادی دی اور انہیں اپنے مقدموں کا فیصلہ اپنے مذہب کے مطابق کرنے کا حق دیا[۱۶]۔

اندلس کے مفتوح عیسائی اپنے مال و جائیداد کے بڑے حصے پر مالک رہے۔اس کے علاوہ ان کو اپنے مال کے منتقل کرنے کا بھی اختیار رہا اور یہ اختیار ایسا تھا جو ان کو کسی سابقہ دور حکومت میں حاصل نہ تھا، لیکن ان کو جزیہ دینا پڑتا تھا۔عورتیں، بچے، عیسائی راہب، اپاہج اور اندھے جزیہ سے مستثنیٰ تھے۔پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی کے مطابق عیسائیوں کی حالت پہلے کے مقابلے میں بہتر ہو گئی تھی، کیونکہ ان پر اب سختی نہیں تھی اور مذہبی معاملات میں وہ پوری طرح آزاد تھے۔وہ مذہبی رواداری اور انصاف پروری کے لیے مسلم حکمرانوں کے ممنون تھے اور حکومتی نظم ونسق اور امن عامہ برقرار رکھنے میں ان کا ساتھ دیتے تھے[۱۷]۔پروفیسر ڈوزی کے علاوہ گستاؤلی بان نے بھی اندلس میں عربوں کی رواداری پر گفتگو کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ عربوں نے اندلس کے باشندوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو انہوں نے شام اور مصر میں غیر مسلمین کے ساتھ کیا تھا۔ان کے مال، ان کے کلیسے سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا اور ان کو اپنے قوانین پر عمل کرنے کی آزادی دی[۱۸]۔عربوں نے اندلس کی عیسائی عوام کے ساتھ رواداری اور انصاف کا جو رویہ اپنایا تھا اس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے احسان مند تھے اور انہوں نے غیر مسلم حکومتوں کے بجائے مسلم حکومت میں سکونت کو ترجیح دی۔

الغرض اندلس میں مسلمانوں نے اقامت اختیار کی اور عیسائیوں کے ساتھ مل کر شہروں اور قصبوں میں رہنے لگے۔عیسائی عوام اپنے مذہب کی وجہ سے دربار کے اعلیٰ عہدوں یا فوجوں کی ملازمت سے محروم نہیں کیے گئے، بلکہ انہیں مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ شہروں اور قصبوں کا ناظم بھی مقرر کیا گیا[۱۹]۔مسلمانوں کی اسی حسن سیاست کا نتیجہ تھا کہ ان کی حکومت دیرپا رہی اور بقائے باہم کی ایک

---

[۱۶] سید ریاست علی ندوی، تاریخ اندلس، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء، جلد اول، ص ۹۷

[۱۷] پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی، عبرت نامہ اندلس (ترجمہ: مولوی عنایت اللہ) مقبول اکیڈمی، لاہور، ص ۱۲۔۴۱۱

[۱۸] گستاؤلی بان، تمدن عرب (ترجمہ: سید علی بلگرامی) مطبوعہ اعظم اسٹیم، حیدرآباد دکن، ص ۲۴۸

[۱۹] ٹی ڈبلیو آرنلڈ، دعوت اسلام، ص ۱۴۲

تاریخی مثال بن گئی۔

اندلس کی طرح سندھ کی سرزمین پر بھی مسلم حکمرانوں نے عدل وانصاف اور مساوات ورواداری اور حسن سلوک کو فروغ دیا اور غیر مسلموں کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کیے۔ سندھ میں مسلم حکومت کا آغاز محمد بن قاسم کی آمد سے شروع ہوتا ہے، جو یہاں کے پہلے گورنر تھے۔ ان کی رواداری اور رعایاپروری کے متعلق ڈاکٹر تاراچند تحریر کرتے ہیں کہ مسلمان فاتح نے مفتوحوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا، انہوں نے مال گزاری کے پرانے بندوبست کو اور پرانے عہدیداروں کو بدستور قائم رکھا، ہندو پنڈتوں اور پجاریوں کو اپنے اپنے مندروں میں پرستش کرنے کی پوری آزادی دے دی۔ کاشتکاروں کو اجازت دے دی کہ وہ پجاریوں کو اور مندروں کو حسب دستور ان کا حق دیتے رہیں[20]۔ محمد بن قاسم نے وہاں کے پرانے نظام کو تبدیل نہیں کیا، راجا داہر کے وزیر اعظم کو وزارت کے عہدے پر برقرار رکھا اور اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے نظام سلطنت مقامی لوگوں کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ انہوں نے نظم و نسق اور امن عام کو برقرار رکھا اور غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کو رواج دیا۔ انہیں مکمل مذہبی تحفظ فراہم کیا، یہاں تک کہ ان کے مذہبی مقامات اور عبادت گاہوں کی حفاظت بھی کی، اور ان کی پنچایتیں بدستور قائم رکھیں۔ انہوں نے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کے حل میں غیر مسلموں سے استفادہ کیا اور مقامی سطح پر انہیں باوقار عہدوں پر فائز بھی کیا جس کی وجہ سے وہاں مختلف مذاہب کے لوگ اپنی مذہبی آزادی کے ساتھ خوشگوار ماحول میں ایک ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے[21]۔

عہد اموی میں عدل پروری، فراخ دلی اور باہمی رواداری کے ایسے مظاہروں سے اموی حکمرانوں اور امرانے عوام وخواص کے دلوں کو فتح کر لیا تھا جس کی وجہ سے مسلم اور غیر مسلم رعایا کے مابین انتہائی خوشگوار اور عمدہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، جن کے معترف غیر مسلم مورخین بھی ہیں۔

---

[20] ڈاکٹر تاراچند، اہل ہند کی مختصر تاریخ، اردو اکیڈمی دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۵۳

[21] ٹی ڈبلیو آرنلڈ، دعوت اسلام، ص ۲۷۱۔

علامہ اقبال اور ہندستان کی فرقہ وارانہ سیاست

ڈاکٹر محمد عمر رضا

شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

urumarjnu@gmail.com

اقبال نے جس زمانے میں اپنی شاعری کا آغاز کیا، ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اور ملک کے شاعر و ادیب جذبۂ حب الوطنی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے سرشار تخلیقات پیش کر رہے تھے۔ اقبال نے بھی 'ہمالہ'[1]، 'تصویر درد'[2]، 'ترانۂ ہندی'[3]، 'ہندستانی بچوں کا قومی گیت'[4]، اور 'نیا شوالہ' جیسی نظموں کے ذریعے ہندوستان سے اپنی محبت کا اظہار کیا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی

---

[1] ۔ اقبال، بانگ درا، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۳، ص ۲۱-۲۲۔

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تری پیشانی کو جھک کر آسماں
امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوارِ ہندوستاں ہے تو

[2] ۔ ماخذ سابق، ص ۷۱۔

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

[3] ۔ ماخذ سابق، ص ۸۳۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

[4] ۔ مآخذ سابق، ص ۸۷۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا

کو فروغ دیا۔ مثلاً 'نیا شوالہ' میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم کر کے اقبال ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر پر زور دیتے نظر آتے ہیں جس میں 'نقش دوئی' کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھادیں
بچھڑوں کو پھر ملادیں، نقشِ دوئی مٹادیں
سُونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اِس کا کلس ملادیں[۵]

لیکن اقبال نے دیکھا کہ فرقہ وارانہ منافرت، اردو ہندی تنازعہ اور سیاسی اختلافات مسلسل بڑھتے جارہے ہیں۔ تمام تر کوششوں کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و عداوت کا سلسلہ ختم نہیں ہو رہا ہے تو اُن کا دل بے چین ہو اٹھا جس کا اظہار انھوں نے اپنی متعدد نظموں میں کیا ہے۔ مثلاً 'صدائے درد' میں وہ کہتے ہیں:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قُرب فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کہ یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آتی نہیں

نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

[۵] ماخذ سابق، ص ۸۸۔

اِس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں[6]

ہندوؤں اور مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی کے سبب ہندستان جس نوع کی محکومی اور بے بسی کی دلدل میں پھنستا جارہا تھا، اُس سے اقبال جیسا رجائی شاعر اپنی ایک نظم 'گلہ' میں کچھ اِس طرح افسوس کرتا نظر آتا ہے:

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تُو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے[7]

ہندوستان جیسے مختلف الاقوام ملک کی ترقی اور کامیابی کا راز یہاں آباد تمام اقوام کی یکساں ترقی و نشوونما میں پنہاں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اقبال ہندوستان میں موجود تمام فرقوں کو اُس کی زبان، تہذیب و تمدن اور مذہب کے ساتھ یکساں ترقی کے لیے عملاً آزادی دینا چاہتے تھے۔ لیکن 'لڑاؤ اور راج کرو' کی پالیسی سے بے خبر بعض ہندوستانیوں کے سبب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و عداوت بڑھتی ہی جارہی تھی۔اِس سے اقبال نہ صرف یہ کہ بے چین اور دل برداشتہ ہوئے بلکہ انھوں نے اِس کے اسباب وعِلل پر سنجیدگی سے غور بھی کرنا شروع کردیا تھا۔انھیں یہ سوال بار بار پریشان کرنے لگا تھا کہ تمام تر کوششوں کے باوجود اِن دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے تئیں اعتماد کیوں بحال نہیں ہو پارہا ہے۔یہی وہ صورتحال تھی جس کے پیش نظر ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الٰہ آباد میں منعقدہ مسلم لیگ کے اجلاس میں اقبال نے کہا تھا :

یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون واشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں، سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے ؟اس کا جواب یہ

---

[6] ۔ماخذ سابق، ص ۴۲۔

[7] ۔اقبال، ضرب کلیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۶، ص ۱۵۱۔

ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور باطناً ہم غلبہ و اقتدار کے خواہشمند ہیں۔۔۔ہم لوگ اِس اصول کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ہر جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کی نشو و نما میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائے[۸]۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے پر سیاسی غلبہ حاصل کرنے کی جو سیاست شروع ہوئی تھی، اُس سے دراصل فرقہ واریت کو فروغ مل رہا تھا اور فرقہ واریت کو اقبال ہندوستان کے لیے انتہائی مُہلِک اور خطرناک تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے خاتمے کے لیے یہاں موجود تمام قوموں کی سیاسی بالادستی کو انھوں نے بحال کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ کیونکہ اِسی میں انھیں ہندوستان کا شاندار مستقبل نظر آرہا تھا اور اسی کے پیش نظر اقبال نے اپنے اس خطبے میں ہندوستان کو ایک ایسے فیڈریشن میں تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا جس کے اندر مختلف النوع اقوام کی علاحدہ علاحدہ ریاستیں ہوتیں۔ کیونکہ اُن کے مطابق:

مغربی ممالک کی طرح ہندستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندوستان بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کیے بغیر ہندستان کے اندر ایک اسلامی ہندستان قائم کریں۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اِسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کیے بغیر اُن سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تا کہ وہ آسانی کے ساتھ اپنی اُن صلاحیتوں کو، جو اُن کے اندر مُضمَر ہیں، عمل میں لا سکیں[۹]۔

یہی وہ تصور ہے جسے اقبال کی فرقہ پرستی اور علاحدگی پسندی پر محمول کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں اِس کی بنیاد پر اقبال کو "دو قومی نظریہ" Two-Nation Theory کا حامی اور مذہبی بنیاد پر ملک کو تقسیم کرنے کے لیے ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ اقبال نے ہندوستان کو دو مختلف ممالک میں تبدیل کرنے کی بات کہی

---

[۸] اقبال، خطبات اقبال (مرتبہ: رضیہ فرحت بانو)، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۴۶، ص ۳۳-۳۴۔

[۹] ماخذ سابق، ص ۳۵-۳۶۔

ہی نہیں[۱۰]۔ انھوں نے تو یہاں آباد مختلف النوع اقوام مثلاً ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی وغیرہ کے درمیان

---

[۱۰] اقبال ہندستان کو مختلف قوموں کی آماجگاہ مانتے تھے۔اس کی بنیاد پر یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی وغیرہ کو الگ الگ قوم سے تعبیر کیا لیکن یہ کہنا کہ وہ Two-Nation Theory کے حامی تھے، یعنی اقبال ہندوستان کو دو علاحدہ علاحدہ ملک میں تقسیم کردینا چاہتے تھے، سراسر غلط ہے۔اردو کے لفظ 'قوم' کو انگریزی کے 'Nation' سے خلط ملط نہیں کیا جانا چاہیے۔اگر اقبال نے ہندستان کو دو علاحدہ علاحدہ ملک میں تقسیم کرنے کی بات کہی ہوتی تو شاید ان پر عائد کیے گئے اس طرح کے الزامات کی وہ تردید نہیں کرتے۔اس زمانے میں 'تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' (علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ ہے جسے اقبال کے کہنے پر سید نذیر نیازی نے کیا تھا) پر لندن کے 'Observer' میں انگلستان کی معروف ادبی شخصیت ایڈورڈ تھامسن (Edward Thomspon) کا تبصرہ شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ کو الٰہ آباد میں منعقدہ مسلم لیگ کے اجلاس میں پیش کردہ خطبۂ صدارت میں اقبال کے مجوزہ منصوبے کو نظریۂ پاکستان سے خلط ملط کردیا تھا۔اس پر اقبال نے تھامسن کو لکھا تھا کہ:

> آپ مجھے 'نظریۂ پاکستان' کا حامی قرار دیتے ہیں مگر پاکستان میرا منصوبہ نہیں ہے۔میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو تجویز پیش کی تھی، وہ صرف ایک مسلم صوبہ کی تشکیل ہے۔یعنی ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک ایسا صوبہ جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔یہ صوبہ میرے منصوبے کے مطابق ہندوستانی وفاق (فیڈریشن) کا ایک حصہ ہوگا۔جبکہ نظریۂ پاکستان میں مسلمانوں کے ایک جداگانہ وفاق کی تجویز رکھی گئی ہے جو براہ راست انگلستان سے مربوط ایک علاحدہ ریاست ہو۔یہ منصوبہ کیمبرج میں پیدا ہوا اور اس کے خالق] چودھری رحمت علی جنھوں نے ۱۹۳۵ میں "Pakistan: The Fatherland of The Pak Nation" کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا تھا۔اس میں انھوں نے پاکستان، بنگستان، عثمانستان، صدیقستان، فاروقستان، حیدرستان، بلوچستان، صفستان اور نصیرستان کی تخلیق کی بات کی تھی۔انھوں نے ہندوستان کے آس پاس کے بہت سے سمندروں اور جزیروں کے بھی نام رکھ دیے تھے۔مثلاً بحر عثمانیہ، بحر صفیہ، بحر مویلا، جزیرۂ عالم، جزیرۂ امین وغیرہ۔اس وقت محمد علی جناح نے چودھری رحمت علی کے نظریۂ پاکستان پر سخت تنقید کی تھی اور اسے ایک طرح سے Walt Disney کے Dreamland اور H. G. Wells کے کابوس سے تعبیر کیا تھا[یہ سمجھتے ہیں کہ گول میز میں شریک ہونے والے ہم مسلمانوں نے مسلم قوم کو ہندوؤں کی نام نہاد ہندستانی قومیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادیا ہے۔ (بحوالہ سید مظفر حسین برنی، محب وطن: اقبال، ہریانہ ساہتیہ اکادمی، چنڈی گڑھ: ۱۹۸۵، ص ص ۴۴-۱۴۰)

یہی نہیں اقبال کے کچھ خطوط دریافت ہوئے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ انڈین یونین کے اندر ایک ایسی خود مختار

ایک دوسرے کے خیالات و نظریات، رسوم و عقائد اور مذہب کے احترام پر زور دیا، کسی بھی قسم کی محکومی اور ایک قوم کا دوسری قوم کو زیر کرنے کے رویے کے برعکس آزادیِ انسانیت کی بات کی۔ اپنے ان خیالات کو اقبال نے چونکہ مذہبِ اسلام کی روشنی میں پیش کیا ہے، شاید اِسی لیے اُن پر مذہبی بنیاد پرستی اور فرقہ پرستی کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ اقبال دوسرے مذاہب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کے مطابق کسی بھی قوم کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ جس مذہب، زبان اور تہذیب کا پروردہ ہو، اس کی تربیت جس ماحول میں ہوئی ہو، اُسے اُس کے مطابق زندگی گزارنے کی بھرپور اور مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ کوئی دوسری قوم اُس کے رسوم و رواج اور مذہب وغیرہ کی تضحیک نہ کرے۔ یہ رویہ یا اصول کسی تنگ نظری یا فرقہ پرستی پر مبنی نہیں بلکہ اِسی میں اقبال کو ملک و قوم اور انسانیت کی بھلائی نظر آتی تھی۔ اپنے خطبے میں انھوں نے واضح انداز میں کہا ہے:

> یہ اصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اِس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے، کسی تنگ نظر فرقہ واری پر مبنی نہیں۔ فرقہ واری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں جو فرقہ واری دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دے، اُس کے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں دوسری قوموں کے رسوم و قوانین اور اُن کے معاشرتی اور مذہبی

ریاست کے حق میں تھے جو پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہو۔ ۶ مارچ ۱۹۳۴ کو کلکتہ کے راغب احسن کے نام ایک خط میں اقبال نے لکھا ہے:

> اس خط کے ساتھ ایڈورڈ تھامسن کے میری کتاب پر تبصرے کی دو کاپیاں منسلک کر رہا ہوں۔ یہ کئی اعتبار سے دلچسپ ہے اور آپ شاید اسے اپنے رسالے میں شائع کرنا پسند کریں گے۔ براہ کرم دوسری کاپی 'اسٹار آف انڈیا' (کلکتہ) کو بھیج دیجیے۔

براہ کرم یہ بھی دھیان رکھیے کہ یہ تبصرہ نگار میری اسکیم کو 'نظریۂ پاکستان' سے مخلوط کر رہا ہے۔ میں تو انڈین فیڈریشن کا حامی ہوں جبکہ نظریۂ پاکستان میں شمال مغربی ہند کے مسلم صوبوں کی ایک جداگانہ فیڈریشن کی بات کہی گئی ہے جو انڈین فیڈریشن سے الگ اور براہ راست انگلستان سے مربوط ہو گا۔ (ماخذ سابق۔)

اقبال کے بیٹے جاوید اقبال نے بھی متعدد ہندوؤں اور مسلمانوں کے نام گنائے ہیں جنھوں نے اس زمانے میں فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے طور پر تقسیم ہند کی تجاویز پیش کی تھیں۔ لیکن اس کی بنیاد پر بقول ان کے:

> انھیں پاکستان بننے میں معاون یا اس کو بنانے والوں میں شمار کرنا درست نہیں۔ (جاوید اقبال، زندہ رُود: حیات اقبال کا اختتامی دور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور: ۱۹۸۷، ص ۳۸۷۔)

اداروں کی دل سے عزت کرتا ہوں بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسب اقتضا میں اُن کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں"[۱۱]۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی سیاست کچھ ایسا رخ اختیار کر رہی تھی جس سے یہاں کا اقلیتی طبقہ اپنے سیاسی وجود کو لے کر بے حد فکر مند ہو گیا تھا۔ اکثریتی طبقے کی سیاسی بالادستی قائم ہو جانے کی صورت میں اقبال جیسے لوگوں کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ ہندوستان مسلسل خانہ جنگی کی دلدل میں نہ پھنس جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خطبے کے اخیر میں انھوں نے یہ بھی کہا:

ہر وہ دستور جو اس تصور پر مبنی ہوگا کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے یا جس کا مقصد یہ ہو کہ یہاں ان اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبات جمہوریت پسندی کا نتیجہ ہیں، اس کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو نادانستہ خانہ جنگی کے لیے تیار کیا جائے۔ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے اس ملک میں اس وقت تک امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس امر کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ہندوستان کی ہر ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر جدید اصولوں پر آزادی کے ساتھ ترقی کرے"[۱۲]۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں اقبال نے اس زمانے کے سیاسی منظر نامے کے تحت جس نوع کے ہندوستان کا تصور پیش کیا تھا یا مسلم اور ہندو اکثریت کی بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم کا مشورہ دیا تھا، اس کے ۶ سال قبل یعنی ۱۹۲۳ء میں ہندو مہاسبھا کے ایک رہنما بھائی پرمانند اور ۱۹۲۴ میں کانگریس کے ایک صدر لالہ لاجپت رائے نے اپنے کئی مضامین میں صوبوں کو ہندو اکثریت اور مسلم اکثریت کی بنیاد پر تقسیم کر دینے کی وکالت کی تھی۔ مثلاً لالہ لاجپت رائے نے کہا تھا:

پنجاب کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا جانا چاہیے۔ مسلم اکثریت والا مغربی پنجاب ایک مسلم حکومت والا صوبہ ہو جائے اور اِسی اصول کا اطلاق بنگال پر بھی ہو سکتا ہے۔ میری اسکیم کے تحت مسلمانوں کے چار صوبے ہوں گے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ مغربی پنجاب، سندھ اور مشرقی بنگال۔ لیکن یہ بات پوری طرح ذہن میں رکھی جائے کہ یہ کوئی متحدہ ہندوستان نہیں ہوگا۔ اِس کا صاف مطلب ملک کو ایک مسلم ہندوستان اور غیر مسلم ہندوستان میں تقسیم کر دینا ہوگا"[۱۳]۔

---

[۱۱] ۔ اقبال، خطبات اقبال (مرتبہ: رضیہ فرحت بانو)، ص ۳۴۔

[۱۲] ۔ ماخذ سابق ص ۵۴

[۱۳] بحوالہ رفیق زکریا، اقبال: شاعر اور سیاست داں، انجمن ترقی اردو، دہلی (ہند)، ۱۹۹۵، ص ۱۴۸۔

جبکہ اقبال نے ایک ایسے متحدہ ہندوستان کا تصور دیا تھا جس میں تمام اقوام کی سیاسی بالادستی پر مشتمل علاحدہ علاحدہ ریاستیں ہوں[۱۳]۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اقبال نے شروع میں باہمی تعاون و اشتراک کی بات کی تھی تاکہ ہندوستان میں مشترکہ تہذیب و قومیت کو فروغ ملے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ ساری کوششیں ناکام ثابت ہورہی ہیں اور غلبے کی سیاست سے ملک کا اتحاد پارہ پارہ ہورہا ہے تو انھوں نے ہندوستان میں آباد تمام اقوام کو سیاسی انتشار اور فرقہ وارانہ کشیدگی سے بچانے کے لیے یہ تصور پیش کیا۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اقبال کو علاحدگی پسند، غدار اور فرقہ پرست کہا گیا اور لالہ لاجپت رائے جیسے لوگوں کو محب وطن۔ یہی نہیں بہت سے ہندو مصلحین اور دانشوران مثلاً راجہ رام موہن رائے، ایشور چندر ودیاساگر، دیانند سرسوتی، کیشوچندر سین اور سوامی وویکانند وغیرہ نے ہندو مذہب کے احیاء کی تبلیغ اور اس کے مطابق لوگوں کی اصلاح کی تو انھیں کبھی فرقہ پرست نہیں کہا گیا اور کہا بھی نہیں جانا چاہیے۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کوئی مسلم دانشور اپنے مذہب کی تبلیغ یا اس کی روشنی میں مسلمانوں کے حقوق کی بات کرتا ہے تو اسے فوراً فرقہ پرست قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ وہ رویہ ہے جس سے اقبال اکثر نالاں رہتے تھے۔ بعض مقامات پر انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا۔ مثلاً ۱۹۳۱ء میں منعقدہ دوسری گول میز کانفرنس کی ایک میٹنگ کے دوران سر تیج بہادر سپرو سے اقبال نے کہا تھا:

---

[۱۳] مسلم ہندوستان کے بارے میں ان [اقبال] کا تصور صرف شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود تھا۔ انھوں نے اعلان کیا۔ ''میں چاہوں گا کہ پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد مملکت بنادی جائے۔ انھوں نے بنگال کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا جہاں اور بہت سے مسلمان رہتے تھے۔ نہ انھوں نے بقیہ ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی ذکر کیا تھا نہ انھوں نے اس بات کا کوئی ہلکا سا اشارہ کیا کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ شمال مغربی مسلم مملکت آزاد رہے۔ اجلاس کی ساری کارروائی کے دوران ہندوستان سے علیحدگی کے بارے میں کوئی تجویز کسی بھی حلقے کی جانب سے پیش نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس ایک کل ہند وفاق کی مکمل حمایت کی گئی جسے اس وقت لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے والے مسلم مندوبین نے منظور کرلیا تھا۔ اقبال نے وضاحت کی کہ مسلمان ایک وفاق کی حمایت اس لیے کرتے ہیں کہ ہندوستان کے دشوار ترین مسئلے یعنی فرقہ پرستی کے مسئلے کا یہی ایک حل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس وفاق میں مسلمانوں کو گیارہ میں سے پانچ ہندستانی صوبوں میں اکثریتی حقوق اور بچے کھچے اختیارات حاصل ہوں گے۔ نیز انھیں وفاق اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں ملیں گی۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ ان کی یہ تجویز ہندوؤں کے خلاف کسی دشمنی پر مبنی نہیں ہے۔'' (رفیق زکریا، اقبال: شاعر اور سیاست داں، ص ۱۳۶۔)

میں گاندھی جی کو سمجھ نہیں سکا جو روحانی اعتبار سے اتنے عظیم ہیں۔جب مالویہ [مدن موہن مالویہ] اور مونجے [ہندو مہا سبھا کے لیڈر ڈاکٹر بی ایس مونجے] ہندو حقوق کے بارے میں جارحانہ گفتگو کرتے ہیں تو وہ خاموشی سے مان لیتے ہیں لیکن جب میں یا دیگر مسلم مندوبین مسلم حقوق کی وکالت کرتے ہیں تو ان کے مقدس چہرے پر برہمی ظاہر ہو جاتی ہے"[۱۴]۔

اس زمانے کے ہندوستان میں چونکہ ایک قوم کا دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرنے کا رویہ بڑی تیزی سے فروغ پا رہا تھا اور مستقبل میں بھی اسی قسم کے نظام کو قائم کرنے کے لیے لیڈران کوشاں تھے اس لیے اقبال ایک ایسے متحدہ ہندوستان کا تصور پیش کرنے لگے تھے جس سے مسئلۂ فرقہ واریت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔یہ دیگر بات ہے کہ اقبال کے اس تصور کو فرقہ پرستی پر محمول کرکے نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن جس فارمولے کے تحت ہندوستان آج ترقی کی راہ پر گامزن ہے، کیا اِس سے ہندوستان کی تمام قوموں کو یکساں ترقی ملی؟ اگر نہیں تو اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ ملک کا اکثریتی طبقہ اقلیتی طبقے سے حب الوطنی کی سند کیوں مانگتا ہے اور اقلیتی فرقہ ہر لمحہ یہ کیوں بتانے پر مجبور ہے کہ وہ محب وطن اور سیکولر ہے۔یہ وہ صورتحال ہے جس کے تعلق سے اقبال اُس زمانے میں فکرمند ہو گئے تھے اور اِسی کے تصفیے کے لیے وہ ایک ایسے متحدہ ہندوستان کی بات کرنے لگے تھے جس میں ایسی ریاستیں ہوتیں جن میں تمام اقوام کی علاحدہ علاحدہ سیاسی بالادستی ہوتی۔کیونکہ انھوں نے اپنی دوربیں نگاہوں سے دیکھ لیا تھا کہ اگر یہ نہیں ہوا تو ہندوستان مستقل فرقہ واریت کی آگ میں جھلستا رہے گا۔

اقبال کا یہ مشورہ مثالی ہو سکتا ہے لیکن اِس کی بنیاد پر انھیں فرقہ پرست، علاحدگی پسند، دو قومی نظریے کا حامی اور مذہب کی بنیاد پر ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والا کہنا صریحاً غلط ہے۔حقیقت یہ ہے کہ فرقہ واریت سے ہندوستان کے اتحاد کو جس نوع کا خطرہ لاحق ہے، اقبال اِس کا مستقل خاتمہ چاہتے تھے۔۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ کے صدارتی خطبے میں انھوں نے جتنے بھی مشورے دیے، اُن تمام کا صرف اور صرف یہی مقصد تھا کہ ہندوستان سے فرقہ واریت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے تاکہ ہندوستان نہ صرف یہ کہ متحد اور پُرامن بلکہ دنیا کے تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک مثالی ملک بن کر ابھرے۔

---

[۱۴] ۔بحوالہ رفیق زکریا، اقبال: شاعر اور سیاست داں، ص ۱۵۲۔

''فضائل بلخ'' کی جدید ایرانی اشاعت

ڈاکٹر عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد
naushahiarif@gmail.com

بلخ (افغانستان) قرون اولیٰ میں ایک شہر علم تھا۔ اس کی علمی مرکزیت، اہمیت اور شہرت کے حوالے سے متعدد عربی کتب ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک شیخ الاسلام صفی الدین ابو بکر عبداللہ بن عمر بن محمد بن داود الواعظ البلخی نے ۶۱۰ھ / ۱۲۱۳ء میں تیار کی جس کا فارسی ترجمہ عبداللہ بن محمد بن القاسم الحسینی البلخی نے ۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء میں کیا۔ اس کتاب کا اصل عربی متن اب نہیں ملتا اور صرف فارسی ترجمہ دستیاب ہے۔ کتاب کا بنیادی موضوع پہلی سے ساتویں صدی ہجری / ساتویں سے تیرہویں صدی عیسوی تک ایسے ستّر [۷۰] محدثین، مشایخ اور علما کا تذکرہ ہے جو بلخی تھے یا کسی طرح سے بلخ سے متعلق رہے ہیں۔ کتاب کی پہلی دو فصلوں میں بلخ کے فضائل اور شمائل پر مبنی روایات پیش کی گئی ہیں۔

اصل عربی متن، اپنی تاریخ تصنیف سے کم از کم ۶۶ سال بعد تک دستیاب تھا کہ اسی سے فارسی ترجمہ ہوا، لیکن اس کے بعد اب تک، عربی متن کے کسی ایک نسخے کا سراغ بھی نہیں ملا اور محققین اصل نصّ کو مفقود یا ضائع شدہ ہی سمجھتے ہیں۔ عبداللہ بن محمد بلخی کے فارسی ترجمے کے گذشتہ صدی تک تین مخطوطات مکشوف ہو چکے تھے، ایک فرانس کے قومی کتب خانے میں اور دو لینن گراڈ، روس کی اکیڈمی آف سائنسز میں۔ ان تینوں نسخوں کی بنیاد پر افغانستان کے نام ور محقق پروفیسر عبدالحی حبیبی (وفات: ۹ مئی ۱۹۸۴) نے یہ فارسی ترجمہ مرتّب کیا جو ''فضائل بلخ'' نام سے بنیاد فرہنگ ایران، تہران نے شہریور ۱۳۵۰ شمسی / ستمبر ۱۹۷۱ء میں شائع کیا (۳۲+۴۹۶ صفحات)۔ پروفیسر حبیبی نے اپنے مقدمے میں اعتراف کیا ہے کہ پیرس اور لینن گراڈ کا ایک نسخہ ناقص ہونے کی وجہ سے کتاب کا آخری حصہ کلی طور پر لینن گراڈ کے دوسرے مکمل نسخے پر منحصر ہے لیکن اس کا کاتب (شریف خواجہ) غلط نویس ہے اور پورے نسخے میں فاحش غلطیاں موجود ہیں، بالخصوص عربی عبارات، اشعار اور احادیث تو نقل کرتے وقت مسخ ہو گئی ہیں۔ اسی وجہ سے پروفیسر حبیبی کی کتاب کے آخری حصے میں بہت سے سُقم رہ گئے جس کا انھیں ادراک تھا۔

پروفیسر نذیر احمد (وفات: ۲۰۰۸) سابق صدر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پروفیسر

حبیبی کے مرتب کردہ متن کی بنیاد پر اس کا ایک ملخص اردو ترجمہ کیا جو ''تذکرۂ علمائے بلخ یعنی تلخیص و ترجمہ فضائل بلخ'' عنوان سے ترقی اردو بیورو (موجودہ نام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)، نئی دہلی نے جولائی ستمبر ۱۹۸۹ء میں شائع کیا (۱۰۹ صفحات)۔ اس ملخص میں پروفیسر نذیر احمد نے پروفیسر حبیبی ہی کی تحقیقات سے استفادہ کیا اور انھی پر انحصار کیا ہے اور سوائے اپنے ایک مقدمے کے، خود سے کوئی تحقیق شامل نہیں کی ہے۔

پروفیسر حبیبی کے مرتبہ فضائل بلخ کی اشاعت سے ۳۱ سال بعد، راقم السطور کو لاہور کے ایک اہل علم اور مخطوطات کی خرید و فروخت کرنے والے خلیل الرحمان داودی کی وفات (۲۶ جنوری ۲۰۰۲ء) سے محض چند روز قبل ۵ جنوری ۲۰۰۲ کو ان کے ہاں فضائل بلخ (فارسی ترجمے) کا ایک قلمی نسخہ ملا جو اس کتاب کا چوتھا مکشوف نسخہ ٹھہرا۔ راقم نے اس نسخے کے تعارف پر مبنی فارسی مقالہ ''نسخۂ نو یافتۂ فضائل بلخ'' تیار کیا اور اسے تہران کے سہ ماہی معارف، مرداد-آبان ۱۳۸۱ش / اگست-اکتوبر ۲۰۰۲ء شمارہ ۵۶، صفحات ۶۰-۹۱ میں چھپوایا۔[۱] چونکہ پروفیسر حبیبی کے مرتبہ متن میں آخری بارہ مشائخ (۵۹تا۷۰) کے حالات لینن گراڈ کے صرف ایک نسخے پر مبنی تھے جو مغلوط اور بے حد مسخ شدہ ہے، اسی بنا پر، پروفیسر حبیبی کے متن میں کافی اغلاط در آئی تھیں۔ میں نے اپنے مقالے میں آخری بارہ مشائخ (۵۹تا۷۰) کے حالات نسخۂ لاہور کی بنیاد پر از سر نو مرتب کر کے پیش کر دیئے اور پروفیسر حبیبی کے مرتب کردہ متن کی اصلاح کی اپنی سی کوشش کی۔ میں نے اس مقالے میں یہ بات بھی لکھی کہ نسخۂ لاہور کی دریافت سے فضائل بلخ (فارسی) جیسے اہم اور قدیم متن کی از سرِ نو ترتیب وتدوین نا گزیر ہے۔ فضائل بلخ کے چوتھے نسخے کے انکشاف کی خبر نے علمی حلقوں میں توجہ حاصل کی اور ۲۰۰۷ میں انگلستان سے ایک ایرانی طالبہ آرزو آزاد نے مجھ سے رابطہ کیا کہ میں انھیں نسخۂ لاہور مہیا کروں۔ میں نے اپنے لیے نسخۂ لاہور سے جو عکس بنوایا تھا وہ انھیں مہیا کر دیا گیا۔ اصل نسخہ داودی صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے شقایق النعمان داودی کی تحویل میں آیا۔ انھوں نے اسے فروخت کر دیا اور وہ ایک واسطے سے کتابخانہ آستان قدس رضوی مشہد، ایران پہنچ گیا۔ اب وہیں محفوظ ہے۔

۲۰۱۱ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے ''قرون اولی میں بلخ شہر کی تاریخ'' کا ایک علمی منصوبہ شروع

---

[۱]۔ بعد میں یہ مضمون میرے فارسی مضامین کے مجموعے ''مقالات عارف''، جلد دوم، شائع کردہ موقوفات دکتر محمود افشار تہران، ۲۰۰۷ء میں بھی شامل ہوا۔

کیا۔اس منصوبے کا ایک حصہ کتاب فضائل بلخ (فارسی) کی از سر نو تدوین اور انگریزی ترجمہ کرنا تھا۔اس کام کے لیے ماہرین کی ایک جماعت مقرر ہوئی جس میں دیگر یورپی ماہرین کے علاوہ ایران سے علی میر انصاری اور آرزو آزاد بھی شامل تھے۔آکسفورڈ یونیورسٹی کے اس منصوبے کے تحت فارسی متن مرکز دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، تہران (۲۰۲۲ء) سے اور انگریزی ترجمہ گب میموریل ٹرسٹ آکسفورڈ (۲۰۲۱ء) سے شائع ہو گیا ہے۔ یہاں تہران سے شائع ہونے والا فارسی متن زیر بحث ہے۔

علی میر انصاری نے فارسی متن کی تدوین میں فضائل بلخ کے اب تک دریافت ہونے والے چاروں نسخوں کو استعمال کیا ہے۔تدوین میں انھیں ادموند ہرزیگ اور آرزو آزاد کا تعاون بھی حاصل رہا ہے۔اس اشاعت میں حسب ذیل مواد شامل ہے:

۱۔ مرتب کا مفصل مقدمہ جس میں کتاب کے مصنف (عربی متن)، مترجم (فارسی ترجمہ) کے حالات، طریقۂ تصنیف و ترجمہ، کتاب کی اہمیت، مخطوطات، فضائل بلخ پر سابقہ تحقیقات[۲] اور پروفیسر حبیبی ایڈیشن پر نقد درج ہوئی ہے۔ یہ حصہ ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ کتاب کا فارسی متن مع نسخوں کے اختلافات کے، ص ۱ تا ۴۳۰

۳۔ ضمائم: (۱) ''مشایخ ہفتادگانۂ بلخ''، میں کتاب میں درج ستر مشایخ کے حالات پر مزید مآخذ کی نشان دہی کی گئی ہے۔(۲) فرہنگ مفردات و ترکیبات۔ (۳) فہرست عمومی اعلام۔(۴) منابع ومآخذ، ص ۴۳۱ تا ۵۱۳

کتاب کے مرتب علی میر انصاری نے ترتیب و تدوین میں خوب محنت کی ہے اور کتاب ایرانی معیار طباعت کے مطابق عمدہ چھپی ہے۔مجھے اپنے تئیں اس بات کی خوش فہمی ہی سہی کہ میں نے فضائل بلخ کا جو نسخۂ لاہور (اب مشہد) متعارف کروایا وہی محرّک بنا کہ اس کتاب کی از سر نو تدوین ہونی چاہیے۔الحمد للہ یہ کام خوب ہو گیا ہے۔ اگر اب کسی کو اس کے اردو ترجمے یا تلخیص کا خیال ہو تو وہ یہی اشاعت سامنے رکھے۔

جاتے جاتے ایک اور بات کا ذکر بھی کر دوں۔ محمد صالح بن امیر عبداللہ بن امیر عبدالرحمان بن شیخ خلیل اللہ اور سجی بدخشی فرخاری نے ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء میں اکابر بلخ کے حالات پر ایک فارسی کتاب

---

[۲]۔ مرتب کے علم میں غالباً پروفیسر نذیر احمد کی تلخیص و ترجمہ فضائل بلخ نہیں تھا، اس کا ذکر ان کے قلم سے رہ گیا ہے۔

تصنیف کی تھی۔ راقم نے ۲۰۰۵ اور ۲۰۰۹ میں مدینہ منورہ کے اسفار میں مسجد نبوی کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ دیکھا تھا۔ مصنف نے فضائل بلخ کتاب کی طرز پر اس کے شروع میں بلخ کے فضائل گنوائے ہیں اور کتاب کے دوسرے حصے میں بلخ کے ستر مشائخ کا تذکرہ لکھا ہے۔ اس کتاب کو غلام حبیب نوابی تیموریان نے مرتب کر کے ''ہفتاد مشائخ بلخ'' نام سے شائع کر دیا ہے (موسسہ انتشارات الازہر، کابل ۱۳۸۹ش)۔ اس کتاب کا زیر بحث فضائل بلخ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے، بس اس کی تقلید ہے اور ناشر نے کتاب کا نام ''ہفتاد مشائخ بلخ'' رکھ کر فضائل بلخ کتاب سے شباہت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اخبار علمیہ

مصر میں بودھ کے مجسمے کی دریافت

ماہرین آثار قدیمہ کو بحر احمر کے جنوب میں واقع قدیم مصری بندرگاہ بیرنیکی کے پاس مہاتما بودھ کا ایک قدیم مجسمہ ملا ہے۔ہندوستان سے بحری جہاز اسی بندرگاہ پر سامان لا کر اتارتے تھے۔یہ مجسمہ رومی عہد سلطنت (۳۱ قبل مسیح سے ۴۳۵ عیسوی تک) میں مصر اور ہندوستان کے مابین تجارتی تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔مصری مجلس اعلی برائے آثار قدیمہ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر مصطفیٰ وزیری نے کہا کہ سلطنت روما کے عہد حکومت میں مصر ایک مرکزی مقام تھا جو رومن سلطنت کو ہندوستان سمیت دنیا کے کئی علاقوں سے جوڑتا ہے۔پتھر سے بنا یہ مجسمہ ۲ فٹ لمبا ہے۔مجسمے میں بودھ نے اپنے کپڑے کے ایک حصے کو پکڑ رکھا ہے۔اس کے علاوہ مجسمے کے پیروں کے پاس کنول کا پھول ہے۔اس تحقیقی ٹیم سے وابستہ ایک محقق کا کہنا ہے مجسمہ کا داہنا حصہ اور پیر غائب ہے۔ان کے بیان کے مطابق اس پتھر کو استنبول کے جنوب میں یا مقامی علاقے سے نکالا گیا ہوگا۔اندازہ ہے کہ یہ مجسمہ اسکندریہ میں تراشا گیا اور ہندوستانی تاجروں کے لیے ایک مندر میں یہیں رکھوا دیا گیا تھا۔ماہرین آثار قدیمہ کو کھدائی کے دوران رومن شہنشاہ مارکس جولیس فلپس (۲۲۴ سے ۲۴۹ قبل مسیح) کے دور کی پتھر پر کندہ ایک سنسکرت عبارت بھی ملی ہے نیز جنوبی ہندوستانی سلطنت ستواہانا کے دو معدنی سکے بھی ملے ہیں۔ (جیروزالم پوسٹ، ۳ مئی ۲۰۲۳)

ایلینز کے متعلق سائنس دانوں کی پیشین گوئی

قریبی ستاروں پر موجود ایلینز (غیر ارضی زندہ کائنات)، ہماری زمین سے خارج ہونے والے موبائل ریڈیو سگنلز کے ذریعہ ہماری زمین کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ایک تحقیق میں کہا گیا ہے کہ موبائل ٹاورز کے سگنلز کے ڈیٹا کا استعمال کرتے ہوئے یونیورسٹی آف مانچسٹر اور ماریشش یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے موبائل ٹاورز سے ریڈیو سگنل کے اخراج کی نقل تیار کی تاکہ چھ نوری سال کے فاصلے پر واقع برنارڈ ستارے پر امکانی طور پر موجود غیر ارضی زندہ کائنات کا مطالعہ کیا جاسکے۔رایل ایسٹرانومیکل سوسائٹی جرنل میں شائع تحقیق کے مطابق تکنیکی طور پر بہت ترقی یافتہ تہذیبیں زمین سے موبائل ٹاورز سگنل سے نکلنے والی امواج سے ہماری زمین کا پتہ لگا سکیں گی۔(یورونیوز، ۴ مئی ۲۰۲۳ء) **ک، ص اصلاحی**

تبصرہ کتب

بستان المحدثین: از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، اردو مترجم: مولانا عبدالسمیع انصاری ایوبی، دیوبندی، تصحیح و تعلیق: مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۸۱۴، قیمت درج نہیں، سن اشاعت ۲۰۲۲ء، پتہ: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، مولویان، کاندھلہ، ضلع شاملی، یوپی، موبائل: ۹۳۵۸۶۶۷۲۱۹، ای میل: nhrashidkandhlavi@yahoo.com

شاہ ولی اللہ دہلوی کے علوم و معارف کے وارث اور مبلغ کی حیثیت سے اور بجائے خود علوم اسلامیہ کے سرچشمہ ہونے کے لحاظ سے حضرت شاہ عبدالعزیز کا رتبہ بلند کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ برصغیر کی دینی علمی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، فتاویٰ، کلام، منطق، فلسفہ جیسے موضوعات پر ان کی کتابیں اور تحریریں اسلامی ہند میں علمی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان ہی کتابوں میں بستان المحدثین کا بھی شمار ہے۔ اپنے موضوع یعنی ذکر کتب حدیث اور احوال رجال حدیث کے ساتھ معلومات کے توازن کی خوبی کی وجہ سے ایسی کتاب بن گئی کہ یہ جملہ ذرا بھی مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتا کہ متقدمین میں بھی ایسی کتاب کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ۱۲۷۷ھ میں بستان پہلی بار طبع ہوئی۔ اس کے بعد کئی بار یہ شائع ہوئی۔ ۱۳۳۴ھ میں مولانا عبدالسمیع دیوبندی کا اس کا پہلا اردو ترجمہ ''روض الریاحین'' کے نام سے شائع ہوا۔ عربی، انگریزی اور کئی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ زیر نظر کتاب میں بستان کی پہلی اشاعت بلکہ کتاب اور اس کے پہلے مترجم اور دوسرے ترجموں سے موازنہ، متعدد ضمیموں کا ذکر جس تفصیل و تحقیق اور تدوین و تعلیق کی خوبیوں سے پیش کیا گیا ہے وہ مولانا کاندھلوی کی غیر معمولی محنت و جستجو اور ان کے بلند پایہ ذوق تحقیق کا شاندار نمونہ ہے۔ پہلے مشتملات کتاب کی فہرست اور پھر ہر فصل و باب کی فہرستیں، پھر اصل ترجمہ بستان کی مکمل فہرست، پھر اعلام متن کی فہرست اور ساتھ ہی حواشی کے اعلام کی بھی فہرست یعنی قریب اسی صفحات کی فہرست مضامین و مشمولات نے قاری کو ایک نظر میں ساڑھے سات سو صفحات میں موجود خزانوں کی کلید سپرد کر دی۔ مولانا کاندھلوی کی وہ خوبی جس کا اعتراف اہل علم و تحقیق کے حلقوں میں عام طور سے کیا جاتا ہے وہ ان کی غیر معمولی محنت و جستجو اور اصل حقائق تک رسائی ہے۔ اس کا عملی نمونہ دیکھنا ہو تو بس یہی کتاب کافی ہے۔ شروع میں انہوں نے زیر نظر کتاب کی اشاعت میں جن پہلوؤں کو مد نظر رکھا وہ متنی تدوین کے طالب علموں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ مثلاً فارسی متن کے اردو حاشیوں سے مقابلہ کرنے میں فارسی نسخہ کے طبع اول کے صفحات بھی لکھ دیے ہیں کہ پڑھنے

والے اگر چاہیں تو اصل کتاب سے مراجعت کر سکتے ہیں اور یہ مراجعت بلا زحمت کے ان کو اسی کتاب سے حاصل ہو جاتی ہے۔ بستان کی اہمیت تو ظاہر ہے لیکن ہمارے نزدیک مولانا عبدالسمیع انصاری کے حالات اور اس سے زیادہ نواب صدیق حسن خاں کے ضمیمہ کا تعارف، دلچسپی اور افادیت کے لحاظ سے اہم ہے۔ بستان المحدثین کا عربی ترجمہ ندوہ کے ایک باصلاحیت عالم ڈاکٹر محمد اکرم ندوی کی توجہ اور محنت کا نتیجہ ہے۔ مولانا کاندھلوی نے مدح وقدح کے تنقیدی معیار سے اس کا جو جائزہ لیا ہے وہ بھی اس کتاب کے مطالعہ کو نافع تر بنا دیتا ہے۔ علمی تنقید میں تعاقب کی اپنی اہمیت ہے، اس لیے یہ کہنا کہ بستان کے متعدد مندرجات اکرم صاحب کے نسخہ میں موجود نہیں اور اکرم صاحب کی دسیوں باتیں بستان کے مندرجات پر اضافہ ہیں۔ ایسے میں مصنف کی منشا اور ان کی بات جاننے کی کیا صورت ہو گی؟ یہ سوال غیر ضروری نہیں کہا جا سکتا اور اس بات کو بھی جائز ہی کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب کی عبارتوں اور اقتباسات کو صرف اس لیے مستند نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہمارے سامنے موجود نسخوں میں نہیں ہیں۔ ہم کو نہیں معلوم کہ کاندھلوی صاحب کے بعض سخت اعتراضات کا کیا جواب دیا گیا لیکن خوشی ہے کہ اعتراضات کے ساتھ یہ اعتراف بھی ہے کہ ڈاکٹر اکرم نے بعض ایسے پہلو نکالے ہیں جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

بستان المحدثین کا نام جتنا زیادہ ہے اس کا مطالعہ اسی درجہ کم کیا گیا۔ اس اشاعت سے بستان مع زائد فوائد کے زیادہ اہم ہو گئی اور سب سے بڑھ کر سہل الحصول بھی بن گئی۔ باقی مضامین، فہارس اور تصاویر اور عکسی نقول نے اس کتاب کو قاموسی شان عطا کر دی ہے۔

جوش ملیح آبادی کا رسالہ کلیم (تعارف و تجزیہ، انتخاب واشاریہ): از جناب جاوید اختر علی آبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۹۱، قیمت ۶۰۰ روپے، سن اشاعت ۲۰۲۲ء، پتہ: دانش محل، امین آباد لکھنؤ اور جاوید منزل/۳۴۲، نوبستہ، منصور نگر، لکھنؤ۔ موبائل: ۸۰۰۵۱۰۰۲۸۷۔ ای میل: jvdans@gmail.com

جوش ملیح آبادی کے متعلق ایک تاثر یہ ہے کہ ان کے مزاج میں تنوع اور تلون دونوں کی کارفرمائی تھی۔ وہ مستقل مزاج نہ ہوئے تو وہ بھی اسی رنگ طبیعت کی وجہ سے۔ یہ بات اور ہے کہ اسی رنگ نے ان کو اردو شاعری میں نہایت اعلیٰ مقام ضرور عطا کیا، جہاں انفرادیت تھی اور امتیاز بھی۔ لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ اردو دنیا میں کم ہی ایسے ہوں گے جن کو بہت جلد فراموش کر دیا گیا۔ شاید اسی لیے ان کے بعض پرستاروں کی نظر میں وہ ایسے مظلوم شاعر و ادیب ٹھہرے جن کا شعری و نثری سرمایہ کیف وکم

میں کثرت کے باوجود اپنے قدر دانوں کی بے توجہی پر شکوہ سنج ہے۔ البتہ کچھ اہل قلم ایسے تھے اور ہیں جو جوش کی یادوں کی برات سے جدا نہیں ہوئے۔ جوش کو یاد کرنے کے لیے ان کی شاعری ہی کافی ہے لیکن ان کی نثر جو علمی وادبی مضامین سے پر ثروت ہے۔ اس کے جائزہ کی ضرورت بہر حال محسوس کی جاتی رہی۔ اس سلسلے میں جوش صاحب کے رسالہ کلیم کی یاد بھی ضروری تھی، کلیم کی عمر کم رہی۔ مگر افکار جوش کی بلاخیزی کے سبب اپنے زمانہ میں وہ نگاہوں کا مرکز بنا رہا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کلیم، جوش کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ تمنا یہی تھی کہ وہ ایسے معیار اور اس طرز کا ہو کہ ایشیا اور یورپ میں بھی اس کی نظیر نہ مل سکے۔ وہ عام روش سے ہٹ کر مختلف النوع ایسے مضامین کو بھی شامل ہو جو سن چالیس کی دہائی میں اردو کے موقر رسالوں کے صفحات سے دور ہی رہتے تھے۔ ایک نقاد نے اس کی وضاحت اس طرح کی کہ ادب و شعر و تنقید کے علاوہ سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور علاقائی موضوعات تھے جن کی وجہ سے رسالہ کلیم کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی لیکن یہ سب بھولی بسری داستان ہے جس کو زندہ کرنے کی توفیق ایک نوجوان ادیب و محقق کو اس طرح ہوئی کہ انہوں نے رسالہ کلیم کے مضامین و مشمولات کا اشاریہ تیار کر دیا، ۳۶ء سے ۳۹ء تک صرف تین سال کی حیات کلیم کو ملی۔ ان تین برسوں کا اشاریہ تیار کرنا محنت طلب تو خیر تھا لیکن اختصار کی وجہ سے زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔ فاضل اشاریہ نگار نے اس اختصار کو رسالہ کے چند اہم مضامین کے انتخاب سے بہت دلچسپ اور فائدہ مند بنا دیا۔ اس انتخاب میں بھی نگہ انتخاب داد کے لائق اس لیے ہے کہ علامہ اقبال پر اثر لکھنوی کی تحریر اور خود نثر کے تعلق سے فراق گورکھپوری کے مضمون سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ حالیؔ، انیسؔ اور الطاف مشہدی، نظیر اکبرآبادی اور ترقی پسند ادب کے تعلق سے شاہکار تحریریں بھی ادب عالیہ کے لطف ولذت سے شاد کام کرتی ہیں۔ اردو زبان کے متعلق بھی بڑے قیمتی مضامین ہیں۔ خصوصاً امام اکبرآبادی کا مضمون، ہندوستان کی جمہوری زبان کا مطالعہ آج پہلے سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ اشاریہ میں ایک خانہ مصنف/مترجم کا ہے۔ اس کے سامنے مضمون کا عنوان، جلد، شمارہ نمبر، ماہ وسال اور صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔ اگست ۳۸ء کے شمارہ میں محمد اسماعیل خان رزمی کے ایک مضمون شبلی اور حریفان شبلی کا ذکر ہے۔ مئی ۳۸ء کے شمارہ میں عبداللطیف اعظمی کا مضمون مولانا عبدالسلام پر بے جا حملہ کے عنوان سے ہے۔ اس علمی ترقی کے لیے جوش کی نظر انتخاب کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ رسالہ کلیم بلکہ خود جوش کی یادوں کی برات کو پھر سے سجانے کے لیے فاضل مرتب لائق تحسین ہیں۔ ان کا سلیقۂ ترتیب بھی داد کے لائق ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن ناصر جامعی: شخص و شخصیت از پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ

کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۸، قیمت ۳۰۰ روپے، سن اشاعت ۲۰۲۱ء، پتہ: براؤن بکس، اپوزٹ بلائنڈ اسکول، قلعہ روڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱، موبائل: ۹۸۱۸۸۹۷۵۹۷۵
ای میل: bbpublication@gmail.com

اصلاحی نسبت ہزاروں کو حاصل ہوئی۔ اسی نسبت سے بیسیوں نہیں سیکڑوں کے مرغ شہرت کو بال و پر ملے اور کچھ اصحاب علم و فضل کو بلند ترین فضاؤں کے لیے اسی نسبت کے پر پرواز نصیب ہوئے اور کچھ ایسے بھی تھے جن کی گوشہ گیری خانقاہی مزاج و یکتائی و یہنائی نے اس نسبت کو تقدس کی صفت عطا کر دی۔ ایسی ہی بظاہر خاموش اور اپنی ہی تلاش میں گم شخصیت مولانا عبدالرحمٰن ناصر کی تھی۔ وہ نسبت جامعی بھی حاصل تھی جو کبھی فقر اور استغنا کی بھی پہچان تھی۔ مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر ذاکر حسین دونوں کی محبتوں نے ان کو ذوالریاستین بنا دیا تھا۔ قلم اٹھانے کا شوق نہیں تھا لیکن طبیعت رنگ پر آئی تو حیات حمید، مباحث القرآن اور مکتوبات خلیل الرحمٰن اعظمی جیسی کتابیں مرتب کر دیں۔ ایسی شخصیت کا ذکر کہیں بھی ہو، دلچسپی سے خالی نہیں۔ پروفیسر ابو سفیان کی شخصیت شناسی معروف ہے۔ ان کو حق تھا کہ وہ اپنے ممدوح کا ذکر کرتے اور دوسروں کو اپنے ساتھ شامل کرتے۔ یہ کتاب اسی حق کا اظہار ہے۔ پروفیسر اصلاحی کا اپنا خاص انداز نگارش ہے۔ وہ الفاظ اور تعبیرات کو اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں۔ نتیجے میں پڑھنے والے کو عجب کچھ لطف کا احساس ہوتا ہے۔ ابتدائیہ میں کچھ جملے نظروں میں سما گئے، جیسے ''زبان اور قوم ہمیشہ پابہ رکاب رہے''، ''مولانا مادر علمی کے نامہ استحضار تھے''، ''مدرسۃ الاصلاح کے ایک مایہ ناز فرزند کا نگار خانہ بن کر اہل علم کے جناب ایستادہ ہیں''، ''جن کی تابانیاں خرابے کے سیم وزر کا پتہ دے رہی ہیں''، ''والدہ محترمہ نے ہماری پرورش ہمارے مستقبل کی تعمیر اور ملکہ سبا بن کر گھر بار کی دیکھ ریکھ میں جو کردار ادا کیا''، ''آنکھوں میں ایسا تفحص''، ''چمنستان شفیع و فراہی کے ایک ایک ذروں کی نگہبانی اور یہی حال ازہار ناطق پر بھی''، ''ایسے دلچسپ جملوں کے درمیان فکر سفیانی کی تراوش بھی کم نہیں''، ''یہ دانشوروں کی ایک جماعت تھی پر اب فکر مفلسین کی جماعت ہے''، ''یہاں اخلاص اور علم و تحقیق دونوں رخصت ہو گئے ہیں صرف دورے باقی رہ گئے ہیں''۔ ''مولانا فراہی نظام اور سرسید دونوں کو خاطر میں نہیں اور مولانا اصلاحی کبھی مولانا مودودی سے مرعوب نہیں ہوئے''۔ ایک لائق احترام شخصیت کی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کے ساتھ یہ کتاب انشائے سفیانی کی وجہ سے بھی مطالعہ کے لمحات کو خوش اوقات بنا دیتی ہے۔ (ع۔ص)

کرونا وائرس: منظوم: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد

پوش۔ صفحات: ۱۵۲۔ ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل ۹۴۳۰۹۶۶۱۵۶۔ ای میل: info@ephbooks.com

دو ڈھائی برس قبل کرونا نامی وبا نے پورے عالم کو جس طرح اپنی گرفت میں لیا، اس سے انسانی معاشرہ کا ہر طبقہ اچھی طرح واقف ہے۔ اس وائرس کی حقیقت جاننے، سمجھنے کے بعد اس سے تحفظ کے لیے عالمی ادارۂ صحت نے جو ہدایات جاری کی تھیں اس سے مکمل نجات آج بھی نہیں مل سکی ہے۔ اس عالمی المیہ کو عالمی ادب کے ساتھ اردو ادب میں خصوصی جگہ ملی اور شعرا نے اس پر جس انداز سے پر درد و سبق آموز نظمیں موزوں کیں، اب وہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ صاحب کتاب نے اس نئے موضوع پر ہند و پاک کے دو سو سے زیادہ مشہور و معروف شعرا کی مناجات، نظموں، غزلوں، رباعیوں، گیتوں، دوہوں، قطعوں وغیرہ پر مشتمل کلام کا ایک دلکش انتخاب اس میں شامل کیا ہے۔ ۲۰ صفحات پر مشتمل مقدمہ میں پہلے مرتب نے اس قسم کے وبائی جرثومہ کی تاریخ، کرونا کی ابتدا، اس کے بڑھتے اثرات سے متعلق عربی، انگریزی کی بعض کتابوں، رپورٹوں اور فلموں کی روشنی میں بڑی قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ ساتھ ہی حکومتوں اور ریاستوں نے عوام کے ساتھ اس ابتلا کے دور میں جو بے اعتدالیاں کی ہیں اس کا ذکر بھی ہے۔ گویا یہ کتاب اس وبا کا ایک تاریخی شعری دستاویز ہے۔ اس کے علاوہ ماسک، سینیٹائزر، سلف آئیسولیشن، کورنٹائن (قرنطیہ)، کمفرٹ زون وغیرہ جیسے لفظوں کا اردو ادب میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی جانب اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ کرونا نے انسانی سماج پر کس طرح اثر ڈالا ہے، مصنف کی آخری آزاد غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اب کے کرونا ایسا آیا پنچھی گانا بھول گئے
پریم ترانہ بھول گئے
کرونا آیا صحرا صحرا آکے ببول گلابوں میں
نفرت کی ہم آگ بجھانا بھول گئے

اشعار کے انتخاب میں معیار کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے۔ صفحہ ۱۷ پر حدیث کے بعض الفاظ غلط چھپ گئے ہیں۔

مضامین پروفیسر افضل الدین اقبال: ڈاکٹر محمد احتشام الدین خرم، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۱۲۸۔ ملنے کا پتہ: ڈاکٹر محمد احتشام الدین خرم، ۱۱-۳-۸۵۵، نیو مالن پالی، حیدر آباد، ۵۰۰۰۰۱ ٹی، ایس (انڈیا)۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء ۔ موبائل نمبر:

۹۸۸۵۹۷۴۸۲۸۔ ای میل:mohdfarrukh77@gmail.com

پروفیسر افضل الدین اقبال کا شمار اردو کے ان ناقدین و محققین میں ہوتا ہے جنہوں نے مدراس، حیدرآباد اور جنوبی ہند کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے تعارف و تجزیہ پر سنجیدگی سے کام ہی نہیں کیا بلکہ اس میدان میں نیک نام بھی ہوئے۔ زیر نظر کتاب کے کل دس مضامین میں علامہ سر محمد اقبال مدراس میں، قاضی بدرالدولہ، مولانا آزاد حیدرآباد میں، کتب خانۂ سعیدیہ، حیدرآباد--، حضرت امجد حیدرآبادی اور ان کا غیر مطبوعہ کلام، حضرت امجد حیدرآبادی کی شاعری، اردو صحافت عہد آصف سابع میں، شاہ عبداللطیف نقوی قادری کی علمی خدمات، نظام اردو ٹرسٹ لائبریری میں اردو اخبارات اور رسائل اور آخری مضمون محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ حیدرآباد میں اردو کے عنوان سے ہیں۔ علامہ اقبال کے سفر مدراس کی روداد اور مولانا آزاد کے نہرو کے ساتھ سفر حیدرآباد کی دلچسپ تفصیلات اس سے پہلے نظر سے نہیں گذریں۔ قاضی بدرالدولہ، ہفت روزہ برگ آوارہ میں شائع ہو چکا ہے لیکن کم یاب ہے۔ کتب خانۂ سعیدیہ کے نادر مخطوطات کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی کے اس بیان ''اس کتب خانہ میں تفسیر، حدیث، فقہ واصول فقہ کی نادر قلمی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو میں نے مدینہ منورہ کے سوا کہیں نہیں دیکھا'' (ص۴۸) سے اس کی علمی و تاریخی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی قدیم عمارت کے متعلق یہ اطلاع بھی ہے کہ یہ فساد میں جلادی گئی۔ بعد میں کانگریس کے مقامی ایم ایل اے نے اس کو اونے پونے میں خریدا پھر میٹرو ٹرین کی وجہ سے یہ عمارت بے نشان ہو گئی (ص۴۷) امجد حیدرآبادی کا شمار ایک زمانہ میں اہم شعرائے معارف میں ہوتا تھا۔ اردو کے متعلق یہ خبر بہت سے لوگوں کے لیے نئی ہے کہ میر عثمان علی خاں کے عہد میں فارسی کو دفتروں سے خارج کرکے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا (ص۹۸)۔ بیشتر مضامین نئے معلومات پر مشتمل اور لائق مطالعہ ہیں۔

دل ہی تو ہے (شعری مجموعہ): امتیاز احمد ماہر، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۱۴۴، ملنے کا پتہ: بک امپور، سبزی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ بہار۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔ سنِ طباعت ۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر: ۹۴۳۰۹۲۶۱۵۶ ای میل: درج نہیں۔

صاحب دیوان شاعر امتیاز احمد ماہر نے گہوارۂ علم وادب علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ خورشید الاسلام، خلیل الرحمن اعظمی، شہریار، قاضی عبدالستار اور پروفیسر نادر علی خاں وغیرہ جیسے اساتذۂ فن سے اکتساب فیض کیا لیکن شاعری کا فن نواب فصاحت جنگ جلیل مانک پوری جو امیر مینائی اور داغ کے ہم

عصر تھے کے شاگرد مولانا رونق استھانوی سے سیکھا۔ ۹۸ غزلوں پر مشتمل ان کا یہ پہلا مجموعہ کلاسیکل اردو شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ روایتی شاعری کے بیشتر اوصاف تخیل کی بلند پروازی، سلاست وروانی، نازک خیالی، فطرت شناسی اور برجستگی وغیرہ سے ان کا کلام مزین ہے۔ اس سے ان کے وہبی شاعر ہونے کا دل میں یقین پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کے جہاں بہت سے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ "میں نے کبھی بیٹھ کر قلم لے کر فکر سخن نہیں کیا، بس چلتے پھرتے کوئی موزوں شعر زبان پر آگیا اور پھر دو چار شعر کا اضافہ کیا اور غزل تیار ہو گئی" (ص ۱۴)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری پیشہ ورانہ نہیں بلکہ اپنے فطری ذوق کی تسکین اور اردو کی خدمت کے مقصد سے کی ہے۔ ان کی غزلوں میں ذاتی تجربات ومشاہدات کا گہرا اور حقیقی رنگ موجود ہے۔ اس کے علاوہ کلام میں ابہام واغلاق کا دور دور تک پتہ نہیں۔ آسان لفظوں میں مافی الضمیر کی ادئیگی اور احساسات وجذبات کی ترجمانی بہت مشکل ہوتی ہے۔ امتیاز ماہر نے یہ مرحلہ آسانی سے طے کیا ہے۔ مایوسی وشکوہ سنجی کے بجائے شاعر نے عزم وحوصلہ کو اپنی شاعری میں زیادہ اہمیت دی ہے۔ درج ذیل اشعار ان کے اسی مزاج کے غماز ہیں۔

کام آئے گی یہ آشفتہ سری کون سے دن
اپنا سر توڑ کر زندان میں در پیدا کر

یہ شعر دیکھیں:

یہ وقت ہے کہ جانب منزل بڑھے چلیں
لیں گے سفر کا جائزہ ختم سفر کے بعد

ایک غزل کے چند سادہ اشعار میں تصوف کے راستہ سے قاری کو کس طرح متنبہ کیا ہے۔

جو چاہو کرو کام کوئی دیکھ رہا ہے ہر لمحہ صبح وشام کوئی دیکھ رہا ہے
ہر کام کا آغاز کسی کی ہے نظر میں ہر کام کا انجام کوئی دیکھ رہا ہے
خلوت میں ہو آرائش زلف ولب وعارض یا آؤ لب بام کوئی دیکھ رہا ہے

بامقصد شاعری کی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں سے آشنا ہی نہیں کرتی بلکہ ساکت موجوں میں اضطراب بھی پیدا کرتی ہے۔ زیر نظر مجموعہ اس وصف سے متصف اور اسلامی فکر کا صحیح ترجمان ہے۔

بہار کے پہلے وزیر اعلیٰ شری کرشن سنہا، سیاسی اور سماجی خدمات: ترتیب وتزئین: ظفر عبد الرؤف رحمانی، ایڈیٹر صفدر امام قادری، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۲۷۲۔ ملنے کا پتہ: رحمانی

فاؤنڈیشن، بیلن بازار، مونگیر، بہار۔ قیمت: ۲۰۰روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء موبائل نمبر و ای میل درج نہیں۔

جنگ آزادی میں شری کرشن سنہا کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ مہاتما گاندھی کی عدم تعاون تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آزادی کے بعد بہار کے پہلے وزیر اعلیٰ بنائے گئے اور بہار کو زراعتی، صنعتی، تعلیمی اور ثقافتی لحاظ سے مضبوط اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے انہوں نے اپنی پوری صلاحیت جھونک دی۔ ان کے سلسلہ میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ وہ مذہبی و ملی تفریق کے قائل نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں بھی مقبول تھے۔ مولانا منت اللہ رحمانی سے ان کے تعلقات تھے اور دونوں نے بعض موقعوں پر مل کر کام کیا تھا۔

رحمانی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام قائم فروغ ادب انجمن ادارے نے اپنی فعال سرگرمیوں کے سبب بہار میں اپنا مقام بنایا۔ ۲۰۱۸ء میں اس ادارہ نے شیر شاہ سوری اور شری کرشن سہائے کی خدمات پر ایک قومی سیمینار منعقد کیا اور بعد میں دونوں شخصیتوں پر اردو، ہندی اور انگریزی میں موصول ہونے والے سہ لسانی مقالات کے الگ الگ مجموعے شائع کیے۔ زیر نظر مجموعہ کے اردو سکشن میں شامل چار مقالات شری کرشن سنہا: شخصیت کی چند جھلکیاں، بابو جی: میری ماں، شری بابو: کچھ بھولی بسری یادیں، بہار کیسری کے نام سے بالترتیب ڈاکٹر افشاں بانو، نیلوفر، ڈاکٹر الفیہ نوری کے قلم سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ لیکن ترجمہ کس زبان سے کیا گیا ہے اس کی وضاحت نہیں ہے۔ پروفیسر ظفر حبیب نے سری کشن سنہا کی عصری معنویت، ڈاکٹر شبیر حسن نے سیاسی و سماجی خدمات، ڈاکٹر ابوسفیان نے حیات اور کارنامے، ڈاکٹر جاوید حسن نے حیات وخدمات اور عصری معنویت کا مطالعہ کیا ہے۔ جمیل مظہری، وفا براہی اور بسمل الہ آبادی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے اور آخر میں شری کرشن سنہا کی حیات کا معلوماتی گوشوارہ ڈاکٹر افشاں بانو نے تیار کیا ہے۔

سماجی وسیاسی خدمات کے ساتھ ساتھ بہار کی تشکیل جدید کی جو ذمہ داری سنہا صاحب پر ڈالی گئی تھی، اس کی پوری تفصیل زیر نظر مجموعۂ مقالات میں جامع انداز میں آگئی ہے۔ آج کے نفرت انگیز ماحول میں اس قسم کے کاموں کی معنویت واہمیت اور ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اردو میں اس قسم کے سوانحی وادبی کام کم نظر آتے ہیں۔ مقالات بالعموم متوازن ہیں۔ ڈاکٹر ابوسفیان کا مقالہ تحقیقی نوعیت کا ہے۔ باقی تمام مقالات یا ترجمہ ہیں یا تاثراتی انداز کے ہیں۔ ادرہ اس اہم علمی وادبی اور قومی خدمت کے لیے لائق تحسین ومبارک باد ہے۔ **ک، ص اصلاحی**

مولانا حبیب الرحمن اعظمی حیات و خدمات: ماہنامہ الماس ممبئی کی خصوصی پیش کش۔ ستمبر ۲۰۲۱ء صفحات ۴۷۹۔ قیمت ۵۰۰ روپئے۔ مرکزِ اشاعت: ادارۂ فکر و فن انوار جامع مسجد گونڈی ممبئی، ۴۳، وہاٹسپ: ۸۷۶۷۴۳۸۲۸۳۔

الماس ممبئی سے شائع ہونے والا ایک معیاری ماہنامہ ہے۔ اس میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ اس کے مشمولات میں اداریہ کے علاوہ مقالات و مضامین، وفیات، ادبی شاہ کار، تعارف کتب وغیرہ شامل ہیں اور ادبیات میں غزلیں اور نظمیں وغیرہ عام طور سے شائع ہوتی رہتی ہیں، استاذ گرامی قدر مولانا حبیب الرحمنؒ (آبائی وطن جگدیش پور پھول پور اعظم گڈھ) دارالعلوم دیوبند کے فنِ حدیث کے ممتاز اساتذہ میں تھے۔ ان کی خاص پہچان فنِ اسماء الرجال میں مہارت تھی، نیز ان کا شمار ملک کے مشہور اہل قلم میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بیس سے زائد قابل ذکر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں چند معروف یہ ہیں: تذکرہ علماء اعظم گڈھ، اجودھیا کے قومی آثار، بابری مسجد: حقائق اور افسانے، مقالات حبیب (۳ جلدیں)، متحدہ قومیت علماء اسلام کی نظر میں، امام ابو حنیفہؒ کا علم حدیث میں مقام و مرتبہ، ہندوستان میں امارت شرعیہ کا نظام اور جمعیۃ علماء کی جدوجہد اور، شرح مقدمہ شیخ عبدالحق، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کا خاص شمارہ ''وفیات نمبر'' وغیرہ۔

الماس کی اس خصوصی پیش کش میں ان کی مکمل زندگی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح یہ خصوصی شمارہ مولانا مرحوم کی زندگی پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا ارشد مدنی اپنے پیغام میں تحریر کرتے ہیں: ''مولانا مرحوم بحیثیت ایک استاذ کے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھانے میں ایک کامیاب مدرس کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔۔۔ کتب بینی ان کا خاص مشغلہ تھا'' (ص ۲۰)۔ مولانا نعمت اللہ اعظمی، جن کے ساتھ مولانا نے کم و بیش چالیس سال کا ایک طویل عرصہ گزارا، اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں: ''مولانا کی خاص صفت ان کی حق گوئی اور بے باکی تھی۔ جس بات کو حق سمجھتے اس کو پوری قوت سے اور برملا کہتے، خواہ سامنے والا کتنا ہی بلند مرتبہ ہو، اس باب میں وہ (لا یخاف فی اللہ لومۃ لائم) کے پورے مصداق تھے''۔ (ص ۱۹)

اس خاص نمبر میں جو مضامین و مقالات پیش کئے گئے ہیں، ان کی ایک جھلک یہ ہے: بیت العلوم کے عظیم سپوت، آہ دادا جان! آہ میرے محسن: مجمع الکمالات شخصیت، مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ ایک محقق، مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ اور جمعیۃ علماء ہند، مولانا اعظمی علم حدیث کا آفتابِ درخشاں، مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ فکر و فن کے چند نقوش، مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ قاضی اطہر مبارک

کے خوشہ چیں، مولانا حبیب الرحمنؒ کی تصانیف کا جائزہ، مولانا حبیب الرحمن صاحب ایک دیدہ ور محقق، اور تذکرہ علماء اعظم گڈھ پر ایک مطالعاتی نظر وغیرہ۔

اس ضمن میں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ علمی دنیا میں مولانا حبیب الرحمنؒ کی خاص شہرت ''تذکرہ علماء اعظم گڈھ'' کے سبب ہوئی۔ اس کتاب کی تیاری میں انہوں نے در در کی خاک چھانی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی بھی تشریف لائے، معارف کے وفیاتی مضامین بھی ان کے اہم ماخذ ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی، اور ایک عرصہ کے بعد ۲۰۱۲ء میں اس کا جدید اور اضافہ شدہ ایڈیشن ''مرکز دعوۃ و تحقیق دیوبند'' سے شائع ہوا ہے۔

اس شمارے میں زیادہ تر نئے اصحاب قلم کے مضامین شامل ہیں۔ مولانا مرحوم جیسی جامع کمال شخصیت کا تقاضا تھا کہ اس میں سینئر اہل قلم سے بھی مضامین لکھوانے کا اہتمام کیا جاتا تو اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوتا۔ کتاب کے عنوانات میں بار ''مولانا حبیب الرحمن صاحب'' کی تکرار مناسب نہیں معلوم ہوتی، علمی مضامین میں، صاحب، نہیں لکھا جاتا۔ اس رسالے کے فاضل مدیر مفتی شرف الدین عظیم اعظمی ہیں۔ (فضل الرحمن اصلاحی)

رجوع، فہم اور تدبر قرآن: چند معروضات از سید مسعود احمد۔ ناشر: ادارہ دعوۃ القرآن، امین آباد لکھنؤ۔ سن اشاعت ۲۰۲۰ء: قیمت: للہ فی اللہ۔

ادارہ دعوۃ القرآن لکھنو کا سہ ماہی ترجمان ''دعوۃ القرآن'' کئی سال سے پابندی سے نکل رہا ہے۔ اس ادارے نے حالیہ برسوں میں کئی قابل ذکر کتابیں شائع کی ہیں مثلاً قرآن مجید بحیثیت مأخذ سیرت از مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، عظمت و اعجاز قرآنی کے عجیب و غریب پہلو ڈاکٹر سید مسعود احمد اور مباحث القرآن از فضل الرحمن اصلاحی وغیرہ۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کے مصنف سابق ڈین فیکلٹی آف لائف سائنسز وصدر شعبہ بایو کیمسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ہیں، جو قرآنیات کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔

اس کتاب میں پانچ ابواب ہیں۔ مثلاً باب اول: رجوع الی القرآن کی مختصر تاریخ مع لوازمِ درس و مطالعہ و خلاصہ قرآن۔ باب دوم: قرآن کریم سے مطلوبہ استفادہ کے شرائط و آداب۔ باب سوم: قصہ آدم و ابلیس: تدبر اور حکمتیں۔ باب چہارم: قصہ موسیٰ و خضر علیہما السلام: تدبر اور حکمتیں پر مشتمل ہے۔ اور آخر میں خلاصہ کلام دیا گیا ہے۔ ان ابواب کے تحت بعض فکر انگیز ذیلی سرخیاں حسب ذیل ہیں: وطن عزیز میں تحریکِ رجوع الی القرآن کی تحریک کے سرخیل شاہ ولی اللہؒ محدث دھلوی، تحریک

رجوع الی القرآن کی امتیازی صفات، مقاصد درس قرآن، صاحب درس کے بنیادی اوصاف، طلبۂ قرآن سے قرآن مجید کے سات مطالبات، فہم قرآن کے لوازم: اس کے اسالیب اور طرز استدلال کی روشنی میں، سیاق کلام کی روشنی ہی میں مراد الٰہی تک پہنچنا ممکن ہے، قرآن مجید کے شاہانہ اسلوبِ کلام کو سمجھے بغیر گمراہی کا خطرہ ہے۔ ناسخ و منسوخ کے صحیح علم کے بغیر علومِ تفسیر وتاویل ناقص ہیں، ان کے علاوہ قرآن مجید کی ایک جامع و مکمل آفاقی تفسیر کی تیاری کے بعض اصولی باتیں، وغیرہ۔

ڈاکٹر سید مسعود صاحب فہم و تدبر قرآن کے تعلق سے معروضات پیش کرتے ہوئے ایک بڑے نکتہ بات یہ لکھی ہے:

> مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ تدبر فی القرآن کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ ہر شخص کسی نہ کسی تفسیر کو لے بیٹھے اور اس کی روشنی میں ہی اپنا سفر تدبر پورا کرے۔ کیوں کہ تدبر کرنے والوں کے بہت سے درجے ہوں گے، کوئی مبتدی ہوگا تو کوئی ثانوی درجے کا طالب علم اور کوئی اعلیٰ درجات کا اور بعض بحمد اللہ ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جو استاد کی مسند پر بیٹھ سکیں۔ اتنے تنوع کی موجودگی میں سب پر ایک جیسا حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ (۱۹۶)

مطلوبہ آفاقی تفسیر کے خاکے کو قرآنی آیات کی سات اقسام میں یوں منقسم کیا گیا ہے: ۱۔ عقائد وعبادات سے متعلق آیات ۲۔ اخلاق و معاملات سے متعلق آیات ۳۔ قانونی و شرعی احکام سے متعلق آیات ۴۔ رسوم و رواج اور قبائلی روایات سے متعلق آیات، ۶ کائناتی مشاہدات سے متعلق اور عصری علوم و نظریات پر اثر انداز ہونے والی آیات ۷۔ متفرق امور مبنی آیات۔

قرآن مجید سے خاطر خواہ ہمارا عملی تعلق دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے، جو ایک مخلص ماہر قرآنیات ٹیم کا ہے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ ایک مختصر سا قرآن انسائیکلوپیڈیا از ڈاکٹر ضیاء الرحمن الاعظمیؒ کے علاوہ اب تک کوئی، قرآنیات کا وسیع دائرۃ المعارف ہم نہ تیار کر سکے: خوار از مہجوریٔ قرآں شدی! (علامہ اقبالؒ) (فضل الرحمن اصلاحی)

ادبیات

نعتِ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم

مقصود احمد مقصود

سابق صدر، شعبۂ فارسی، عربی و اردو، بڑودہ یونیورسٹی۔ بڑودہ۔ ۳۹۰۰۰۲

تمنا ہے زبوں حالی بیاں ان سے کریں جاکر — عجب کیا ان کی ہو جائے عنایت کی نظر ہم پر

خدا مل ہی نہیں سکتا بغیرِ نسبتِ آقا — یہ پیغامِ حقیقی جاکے پہنچادے کوئی گھر گھر

ہے کیا ہی عظمتِ سرکارِ عالی جاہ کا کہنا — ہدایت کے وہی نیّر، وہی بخشش کے بھی محور

ہے لازم ہم پہ سب کو چھوڑ کر ان کے ہی ہو جائیں — کہ اپنی مغفرت مبنی ہے ان کی ہی شفاعت پر

پہنچ جاتے ہیں طیبہ جن سے اڑ کر ہم گھڑی بھر میں — جواں ہر دم رہیں یارب تصور کے وہ بال و پر

شہ ابرار کا دیدار جب بھی خواب میں ہوگا — کریں گے عرض اپنا مدعا ہم ان سے رو رو کر

نبیؐ کی تھوڑی بھی توہین سے مٹ جاتا ہے ایماں — مدار اس کا حقیقت میں ہے توقیر رسالت پر

ہے ان کی شانِ بینائی پہ عقلِ نارسا حیراں — وہ سب کچھ دیکھتے تھے اپنے کاشانے میں ہی رہ کر

وہ آگے اور پیچھے دیکھتے تھے بے گماں یکساں — اسی کے ساتھ ان پر دل کی کیفیت بھی تھی اظہر

نہ تھی محتاج ہرگز نور کی بینائی روشن — اندھیرے میں بھی واضح دیکھتے تھے حضرتِ سرور

کسی کو بد دعا کا ڈر نہ بدلے کا تھا اندیشہ — کہ وہ تو خیر خواہی، عفو و رحمت کے ہی تھے پیکر

درودِ پاک ان کے قرب کا واحد وسیلہ ہے — لہٰذا پڑھتے رہنا چاہیے مقصود اسے اکثر

غزل

طارق غازی (وھٹبی، کینیڈا)

m.tariqghazi@gmail.com

یہ زمیں اوقات کی پابند ہے — زندگی لمحات کی پابند ہے

قتل و خوں اگلی صدی کا درد تھا — یہ صدی صدمات کی پابند ہے

جیب و دل رکھیے کشادہ گاہ گاہ — دوستی سوغات کی پابند ہے

ان ستاروں میں نہیں دل کا سکوں
قسمت اب آفات کی پابند ہے

برسوں چلتا تھا دبے پاؤں نظام
رونق اب آنات کی پابند ہے

گھر عجائب گھر نئے آلات کے
جیب ایجادات کی پابند ہے

ہر گریزاں لمحہ ہے زیر قلم
فکر بھی حالات کی پابند ہے

دل تڑپتا ہو تو بات آگے بڑھے
سوچ محسوسات کی پابند ہے

عشق تھا صورت گری دو جان کی
یہ محبت ذات کی پابند ہے

دن ہے مکروہات دنیا کا اسیر
اس کی محفل رات کی پابند ہے

لڑکی بیٹھی ہے کنواری آج تک
شادی بھی بارات کی پابند ہے

طارق آنکھوں کا دوآبہ خشک ہے
کشت جاں برسات کی پابند ہے

غزل

جمیل مانوی

سہارنپور۔۹۸۹۷۵۲۳۸۱۵

ادھورے پیار کی لذت سے آشنا ہوں میں
اُسے خبر بھی نہیں جس کو چاہتا ہوں میں

براہِ راست تعلق نہیں مگر پھر بھی
اداس جب اسے دیکھا تڑپ اٹھا ہوں میں

بتا تو دے مجھے منزل کہاں ہے، راہ کہاں
مرے رفیقِ سفر کتنا تھک گیا ہوں میں

میں اب یہ بوجھ اتاروں تو کچھ سکون ملے
مرا یہ وہم کہ دنیا سے آشنا ہوں میں

مرے سلیقے سے وحشت ہے کم سوادوں کو
اسی لیے تری محفل سے اٹھ گیا ہوں میں

نہ فکر میں وہ بلندی نہ عزم میں وہ ثبات
یہی سبب ہے کہ در در بھٹک رہا ہوں میں

قدم قدم پہ ہزیمت نفس نفس پہ عذاب
کوئی امید تو ہے جس پہ جی رہا ہوں میں

ملی ہے مہلت غم بس یہی غنیمت ہے
اسی کو عین مسرت سمجھ رہا ہوں میں

ہزاروں داغ ہیں دامن پہ جانِ جاں لیکن
یہ داغ پھر بھی نہیں ہے کہ بے وفا ہوں میں

ترے سلوک نے خود بیں بنادیا ہے مجھے
یہ دیکھ اپنے ہی زخموں سے کھیلتا ہوں میں

مرا علاج مسیحا کے بس کی بات نہیں
خود اپنے درد کی لذت پہ مرمٹا ہوں میں

نظم

نغمۂ محمدیؐ[۱]

شاعر: جان وولفگینگ وون گوئٹے

اردو ترجمہ: شان الحق حقی

وہ پاکیزہ چشمہ
جو اوجِ فلک سے چٹانوں پہ اترا
سحابوں سے اوپر بلند آسمانوں پہ جولاں ملائک کی چشم نگہداشت کے سائے سائے
چٹانوں کی آغوش میں عہد برنائی تک جوئے جولاں بنا
چٹانوں سے نیچے اترتے اترتے
وہ کتنے ہی صد رنگ اَن گھڑ خزف ریزے
آغوشِ شفقت میں اپنی سمیٹے
بہت سے سسکتے ہوئے رینگتے، سُست کم مایہ سوتوں کو چونکاتا، للکارتا ساتھ لیتا ہوا خوش خراماں چلا
بے نمو وادیاں لہلہانے لگیں
پھول ہی پھول چاروں طرف کھل اٹھے
جس طرف اُس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رخ پھر گیا
اُس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضِ قدم سے بہار آ گئی
یہ چٹانوں کے پہلو کی چھوٹی سی وادی ہی کچھ
اُس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منزل نہ تھی
وہ تو بڑھتا گیا
کوئی وادی، کوئی دشت، کوئی چمن، گلستاں، مرغزار

---

[۱] مشہور زمانہ جرمن شاعر گوئٹے (۱۷۴۹۔۱۸۳۲) نے ایک نعت مبارکہ جرمن زبان میں کہی تھی۔ شان الحق حقی نے اس کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔

اُس ﷺ کے پائے رواں کو نہ ٹھہرا سکا
اُس ﷺ کے آگے ابھی اور صحرا بھی تھے
خشک نہریں بھی تھیں، اُترے دریا بھی تھے۔
سیلِ جاں بخش کے، اُس ﷺ کے سب منتظر
جوق در جوق پاس اُس ﷺ کے آنے لگے
شور آمد کا اُس ﷺ کی اٹھانے لگے
راہبر ﷺ ساتھ ہم کو بھی لیتے چلو
کب سے تھیں پستیاں ہم کو جکڑے ہوئے
راہ گھیرے ہوئے، پاؤں پکڑے ہوئے
یاد آتا ہے مسکن پرانا ہمیں
آسمانوں کی جانب ہے جانا ہمیں
ورنہ یونہی نشیبوں میں دھنس جائیں گے
جال میں اِن زمینوں کے پھنس جائیں گے
اپنے خالق کی آواز کانوں میں ہے
اپنی منزل وہیں آسمانوں میں ہے
گرد آلود ہیں پاک کردے ہمیں
آ۔ ہم آغوشِ افلاک کردے ہمیں
وہ رواں ہے، رواں ہے، رواں اب بھی ہے
ساتھ ساتھ اُس کے اک کارواں اب بھی ہے
شہر آتے رہے شہر جاتے رہے
اُس ﷺ کے دم سے سبھی فیض پاتے رہے
اُس ﷺ کے ہر موڑ پر ایک دنیا نئی
ہر قدم پر طلوع ایک فردا نئی
قصر ابھرا کیے خواب ہوتے گئے
کتنے منظر تہہِ آب ہوتے گئے

شاہ اور شاہیاں خواب ہوتی گئیں
عظمتیں کتنی نایاب ہوتی گئیں
اُس ﷺ کی رحمت کا دھارا ہے اب بھی رواں
از زمیں تا فلک
از فلک تا زمیں
از ازل تا ابد جاوداں، بیکراں
دشت و در، گلشن و گل سے بے واسطہ
فیض یاب اس سے کل
اور خود کل سے بے واسطہ

ضیاء الرحمن اصلاحی

شارجہ، متحدہ عرب امارات
khanyasrib@gmail.com

جہاں جلوہ ہی جلوہ ہے جہاں ہر شے نرالی ہے
سنبھل جا اے دل حیراں وہ منزل آنے والی ہے

نہ کر سجدہ بغیر اذن بے تابی میں اے شیدا
نگاہ یار میں پاس ادب کی پائمالی ہے

حریم قدس میں چرچا ہے میری بادہ نوشی کا
وہاں جنت میں میرے نام جوئے مے نکالی ہے

کلی کا گل کی منزل تک سفر دشوار ہے لیکن
اسے آسان جو کرتا ہے وہ ذوقِ جمالی ہے

کسی نے میرے کانوں میں یہ کی ہے آکے سرگوشی
نوا ہے تیری قدوسی ترا نغمہ بلالی ہے

اٹھا ساغر ترے مخمور ہونے کی گھڑی آئی
چمن میں غنچہ خنداں، وجد میں پھولوں کی ڈالی ہے

شب مہتاب میں ہے منعکس فردوس کا جلوہ
گہر کا سینہ ایسے جلوۂ رنگیں سے خالی ہے

ترے سینے میں وسعت، وسعت افلاک سے بڑھ کر
ترے طرز تفکر میں بڑی نازک خیالی ہے

ترا ذوق طلب موجیں اٹھاتا ہے سمندر میں
وہ موجیں جن کے مد و جزر میں شان جلالی ہے

ترا حسن تخیل جلوہ فرما بحر و بر میں ہے
ترے شوق تعلی نے زمیں سر پر اٹھا لی ہے

تری عظمت کے آگے سرنگوں افلاک رہتے ہیں
پہاڑوں کو ملی ہے جو بلندی وہ مثالی ہے

کشاد دل میں اپنے تو فراز طور پیدا کر
ترے بس میں ہے تو چاہے تو اس میں نور پیدا کر

معارف کی ڈاک

معارف، مئی ۲۰۲۳ بروقت موصول ہوا، اس کے لیے ممنون ہوں، یہ بڑی قابل ستائش بات ہے کہ رسالے کی ڈیجیٹل کاپی، یکم تاریخ کو آنلاین ہو جاتی ہے یا بذریعہ ایمیل اس کے منتظرین کو بھیج دی جاتی ہے۔ یقین کیجیے مجھے مہینے کی آخری تاریخوں میں معارف کا شدت سے انتظار رہتا ہے اور دن گنتا ہوں کہ کب یکم تاریخ آئے اور ان باکس میں معارف نظر آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ جونہی رسالہ کھولتا ہوں تو بعض بے کیف اور بے فائدہ مضامین دیکھ کر اسے ایک طرف رکھ دیتا ہوں اور پھر سے اگلے ماہ کی یکم تاریخ کا انتظار شروع کر دیتا ہوں۔

مئی کے شمارے میں ایک مخلص نے دینی مضامین کے بارے میں راقم السطور کا نام لیے بغیر میرے ایک خط (مطبوعہ معارف، مارچ ۲۰۲۳) کا حوالہ دیا ہے اور کچھ شکایتی لہجے میں کہا ہے کہ میرا نقطہ نظر دینی مضامین کے بارے میں ایسا کیوں ہے۔ اس سلسلے میں راقم اپنا موقف پھر سے پیش کرتا ہے کہ معارف ہمیشہ سے دین اور ادب اور اسلامی ثقافت کا مشترکہ رسالہ رہا ہے۔ مولانا سلیمان ندوی کی وفات تک کے پرچے اٹھا کر دیکھ لیجیے ہر شمارے میں دین کے ساتھ ادب اور ثقافت پر بھی مضامین ہوتے تھے بلکہ برصغیر میں اردو زبان میں لکھے جانے والے بہترین مضامین اسی میں چھپتے تھے، یہی وجہ تھی کہ اس کے قارئین کے حلقے میں دینی اور ادبی شخصیات تھیں۔ مولانا کی وفات کے بعد اس رجحان میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہوتی رہی اور اب عالم یہ ہے کہ کہیں کسی شمارے میں ادب اور ثقافت کے حوالے سے کوئی مقالہ چھپ جاتا ہے، ورنہ غلبہ دینی موضوعات کا ہے۔

ہماری معارف سے یہ توقع نہیں کہ ہنسنے ہنسانے کا کام انجام دے، لیکن یہ توقع ضرور ہے کہ دینی اور کلامی مضامین کا طرز تحریر بھی شگفتہ ہو سکتا ہے۔ اسلامی ادب اور ثقافت (عربی، فارسی، اردو زبانوں کے حوالے سے) کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ معارف، اگر دینی پرچہ ہے تو بھی ادب اور ثقافت کے پہلوؤں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے بہت کچھ نیا لکھا اور چھاپا جا سکتا ہے۔ ہمارے مخطوطات کا تعارف، قدیم اسلامی عمارات کے کتبات، قدیم ملبوسات، مسکوکات، کیا کیا میدان ہیں تحقیق کے۔

ہر قاری کی اس کے محبوب رسالے سے ایک وابستگی اور توقع ہوتی ہے، وہ اسے اپنی توقعات کا آئینہ دار دیکھنا چاہتا ہے۔ جب توقعات کے آئینے پر دراڑ پڑتی ہے تو وہ اس کا اظہار ضرور کرے گا۔ باقی آئینے کو بچا کر رکھنا آئینہ دار کا کام ہے۔ اس بات کا اظہار بھی برمحل ہے کہ معارف کو کس دور میں کیسے مدیران میسر آتے ہیں، ان کی ذاتی دل چسپی، رجحانات اور وسعت نظر بھی رسالے کا

مزاج بدلنے میں کارفرما ہیں۔

عارف نوشاہی
naushahiarif@gmail.com

معارف: شکریہ۔اگرچہ میری ذاتی دلچسپی تاریخی مضامین سے ہے لیکن ادبی اور بالخصوص ثقافتی مضامین سے ہمیں کوئی بیر نہیں لیکن عمدہ لکھنے والے تو ہوں (مدیر)

سید ریاست علی ندوی کی ''اسلامی نظام تعلیم''

دارالمصنفین محتاج تعارف نہیں۔اس کے نام اور کام سے دنیائے علم وادب واقف ہے۔ سلسلۂ سیرۃ النبی ﷺ سلسلۂ سیر الصحابہ وتابعین و تبع تابعین تذکرہ و سوانح، سلسلۂ تاریخ اسلام، سلسلہ قرآنیات، اسلام اور مستشرقین، سلسلۂ علوم وفنون، سلسلۂ تاریخ ہند، مقالات و خطبات، مکاتیب، سفر نامے، ادب و تنقید، فلسفہ و کلام۔ نفسیات و عمرانیات، اشاریہ، کتابیات، اہم عصری مسائل، درسی کتب، انگریزی کتب، ہندی کتب اور متفرق کتابیں، اس کی علم نوازی، ادب پروری اور عشوہ سنجی کی درخشاں مثال ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اس کے وابستگان ایک مخصوص ماحول میں رہنے کے باوجود اور حالات کے سرد و گرم کے چشیدہ ہوتے ہوئے بھی ہند کے اہل اسلام کے واقعی مسائل سے پہلو تہی نہیں کی نیز اپنی نگارشات وکاوشات کے ذریعے فکری غذا رسانی میں کمی نہیں کی۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ملک عزیز کی موجودہ مرکزی سرکار ایک مخصوص نظریے کی حامل تنظیم کی سرکار ہے جس کے عزائم اور منصوبے پردہ خفا میں نہیں۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی اس کی ایک مثال ہے جس کے حقائق کمنیات اور مضمرات کا اندازہ مطالعہ کے ذریعے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔

بہر کیف ہمیں حقیقت کے اس تلخ جام کو اپنے لبوں سے لگا لینے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی تعلیم کی بات اسلام کے بغیر ادھوری اور بے معنی ہے۔ کیوں کہ اسلام ایک مکمل دین اور مستقل تہذیب ہے۔ اس لئے موجودہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کو اس نکتے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بہر حال اسلام کے تعلیمی نظام کے افہام و تفہیم اور اس کی تعلیمی تشکیل کی تشریح و تعبیر کے تعلق سے بہت سی کتابیں ہیں جو مفید اور ممد و معاون ہیں۔اسی موضوع کے متعلق ایک بے حد اہم کتاب سید ریاست علی ندوی کی ''اسلامی نظام تعلیم'' ہے۔ جس کی اشاعت دارالمصنفین کے ذریعے ہوئی ہے جو ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں، اسلامی نظام تعلیم کے کیف و کم، زیر و بم اور پیچ و خم کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

یاد ش بہ خیر کچھ سالوں قبل اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی کے ذریعے امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے زیر انتظام المعہد العالی للتدریب في القضاوالا فتاء کے ہال میں دوروزہ سیمینار بعنوان ''معاصر دینی تعلیم، احوال ومشکلات، مسائل ومشکلات''منعقد ہوا تھا۔ جس میں پیارے وطن کے جامعات، ادارہ جات، مؤسسات ومنظمات کے نمائندگان اور ارباب حل وعقد اور اصحاب بست وکشاد شریک تھے۔ جنہوں نے اپنے وقیع مقالات اور قیمتی محاضرات سے اسے زینت بخشی اور اسے کام یابی سے ہم کنار کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ میں اس کی جملہ نشستوں میں تقدیم وتاخیر کے ساتھ شریک وسہیم رہا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان مندوبین وشرکا میں شاید ہی کسی مضمون نگار، مقالہ نویس اور محاضر نے اپنے مضمون مقالے اور محاضرے میں اس کتاب کے حوالے سے کوئی بات کہی ہو۔ اس رویے، نظریے، اندازے اور زاویے کو فکری المیے اور انٹلیکچوئل ٹریجڈی Intellectual Tragedy سے تعبیر کرتا ہوں کیوں کہ دینی تعلیم کا یہ رسالہ زبان حال سے یہ کہتے ہوئے نظر آتا ہے:

رہتا ہوں وفا کی دنیا میں مجنوں کی طرح حیراں، لیکن
چرچا ہی نہیں ہوتا کچھ بھی دنیا میں مرے افسانوں کا

بہر حال ماضی میں قوم کے علمی مذاق کی پستی کا جو تلخ تجربہ علامہ شبلی اور سید الطائفہ کو تھا، اسی تلخی سے آج کے کاروان علم وادب بھی دوچار ہیں جو یقیناً ایک لمحہ فکریہ ہے:

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے
خامہ انگشت بہ دنداں ہے اسے کیا لکھئے

میرے محدود مطالعے، محصور مشاہدے اور مقدور مکالمے کے مطابق اس کے اسباب وعلل، عوامل و وجوہات اور محرکات ومؤثرات کا اگر کوئی تجزیاتی لفظ ہو سکتا ہے تو وہ بے حسی کا لفظ ہوگا، اپنے وسیع تر مفاہیم وتصورات اور ابعاد وجہات میں جس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے شعور غم:

شعور غم کے سوا کچھ نہیں ہے غم کا علاج
مگر یہ بات زمانے کو کون سمجھائے

لیکن یہ غم اس وقت اور دوچند ہو جاتا ہے جب کاروانہ علم وادب بھی بہ استثنائے چند اس کی سنگلاخ وادی اور دشوار گزار گھاٹی سے دامن کشاں گزرتے ہوئے سرد مہری اور بے التفاتی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ ایسے موقع پر جمیل مظہری کا یہ شعر ذہن پر دستک دینے لگتا ہے:

ہے اب تو دھوپ آ پہنچی جھاڑیوں کے اندر بھی

اب پناہ لینے کو تیرگی کہاں جائے

ایسی صورت میں علمی اثاثے، ادبی سرمایے اور فنی ذخیرے اپنی قسمت پے، شمع مزار کی طرح ماتم کناں اور چراغ گور کی مانند نوحہ گر نظر آتے ہیں نیز زبان حال سے یہ کہتے ہیں:

غیروں نے جو کیا اس پے آنسو بھی کچھ بہے
اپنوں نے جو کیا وہ کوئی کس طرح کہے

دارالمصنفین بھی ایسی ہی تہذیبی وراثت، ثقافتی ثروت اور تمدنی دولت کا حامل ادارہ ہے۔ جس کے بانی اور وابستگان نے اسے اپنے خون جگر سے سینچا ہے نیز اپنی صدق وصفا، مہر ووفا اخلاص وللہیت، نالۂ نیم شبی، دعائے سحر گاہی، آہ صبح خیزی، مشیت ایزدی، غایت ربانی اور توفیق خداوندی سے وادی غیر ذی زرع کو علم وادب، فکر وفن اور شعر و سخن کے پھولوں کی مہکتی وادی بنا دیا جس کی باد بہاری شیدا پناہ علم و ادب، شائقین فکر وفن اور دلدادگان شعر سخن کے مشام جاں کو معطر کرتی ہے۔ غرضیکہ یہ ایک ایسا علمی جزیرہ ہے جس کی صوری ومعنوی سیر کے علم وفن سے اشتغال رکھنے والے طبقے تمنائی رہیں گے۔

راجو خان، بیگو سرائے
۹۱۲۲۷۸۰۱۹۸

فارسی کے اشعار

معارف اپریل ۲۰۲۳ء کے شمارے میں محترم عارف نوشاہی صاحب کی ناقدانہ تحریر پڑھی۔ یہ میرے لیے باعث مسرت ہے کہ محترم نے میرے مضمون پر ناقدانہ نظر ڈالی اور خامیوں سے آگاہ کیا۔ میں نے یہ مضمون ۲۰۲۰ء میں معارف کے لیے بھیجا تھا۔ قریب دو سال بعد یہی مضمون نظر ثانی کے لیے مجھے ای میل پر ملا، جب کہ میں حالت سفر میں تھا۔ مضمون کے ڈاؤن لوڈنگ کے بعد دیکھا کہ ایم ایس ورڈ میں اشعار کی ترتیب بدل گئی ہے۔ شروع میں درج جگر مرادآبادی اور مولانا تھانوی کے اشعار کی بھی ہیئت بدل چکی ہے۔ میرے ذریعے اصلاح کے بعد مضمون دوبارہ بھیج دیا گیا لیکن اس بات کا خدشہ دامن گیر تھا کہ دوبارہ ڈاؤن لوڈنگ کے بعد ترتیب بدل نہ جائے اور ہوا بھی وہی۔ مولانا روم کے شعر ''صبح صالح ترا صالح کند'' کی ترتیب الٹ گئی۔ اور ایسے ہی دیگر اشعار کے ساتھ بھی ہوا۔ فارسی اشعار کے ترجمے کے وقت ''لغات کشوری'' میرے پیش نظر تھی۔ لغات کشوری (ص ۱۳۷) میں ''جیب'' کا معنٰے گریبان، پیرہن، سینۂ دل، مجازاًوہ تھیلی جو نیچے گریبان کے

سیتے ہیں، اب مختلف مقام پر لگائی جاتی ہے درج ہے۔ لیکن دامن کہیں نہیں لکھا ہے لیکن محترم نوشاہی صاحب نے اس مقام پر جس طرح رہنمائی کی ہے وہ میرے سر آنکھوں پر ہے۔

محترم نوشاہی صاحب کا یہ جملہ ''افسوس کہ اب علمائے ادبیات فارسی شبلی نعمانی و سلیمان ندوی کے ادارے میں فارسی جاننے والے اور فارسی ذوق رکھنے والے بھی نہیں رہے'' کچھ سخت لگ رہا ہے۔ کمپیوٹر میں ڈاؤن لوڈنگ اور ایم ایس ورڈ میں کٹ پیسٹ کے دوران اس طرح کی غلطیوں کو راہ مل گئی۔ جس کمپیوٹر پر اصلاحی کام ہوا تھا اس میں نوری نستعلیق فانٹ لوڈ بھی نہیں تھا۔ مضمون نگار کی حیثیت سے اس کی جملہ ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

مبشر اعجاز
ajazmobashshir@gmail.com

رسید کتب موصولہ

اردو زبان مقبول بھی مظلوم بھی: ڈاکٹر سید احمد خان (مرتب)،اردو بک ریویو،فرسٹ فلور،ایم-پی اسٹریٹ،پٹودی ہاؤس،دریا گنج، نئی دہلی۔ صفحات ۲۰۰،سال اشاعت ۲۰۲۲ء،قیمت ۳۰۰روپے۔ موبائل نمبر:۹۹۵۳۶۳۰۷۸۸۔

اسلامی تہذیب کا عروج وزوال: محمد نفیس خان ندوی۔ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ، صفحات ۲۶۴،سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۲۲۰روپے،موبائل نمبر:۹۹۱۹۳۳۱۲۹۵۔

بیان شبلی-۳: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،دارالمصنّفین،اعظم گڑھ۔ صفحات ۲۲۴،سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۳۵۰روپے،موبائل نمبر:۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵۔

تطور الصحافۃ العربیۃ فی الھند بعد الاستقلال:(عربی)ڈاکٹر سرور عالم ندوی۔ مکتبہ القاضی پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)، صفحات ۲۵۶،سال اشاعت ۲۰۱۷ء، قیمت ۳۳۰روپے، موبائل نمبر:۸۱۷۱۵۵۴۵۲۶۔

سید المحدثین امیر المومنین فی الحدیث اور صحیح بخاری کی خصوصیات: مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری، جمعیۃ المعارف الاسلامیۃ، ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، صفحات ۲۷۲، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۲۵۰روپے،موبائل نمبر:۹۹۸۴۷۷۸۸۰۰۔

سیرت نبویؐ کے نایاب گوشے: ڈاکٹر سرور عالم ندوی،مکتبہ الانور دیوبند، صفحات ۱۶۶،سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۲۳۵روپے،موبائل نمبر:۸۴۳۴۶۵۳۸۱۶۔

فکر انگیز مثالیں(قرآن وحدیث سے): (مترجم)عبدالباسط ندوی، دارالافتاء، پھلواری شریف، پٹنہ۔ صفحات ۲۱۶،سال اشاعت ۲۰۱۱ء، قیمت ۱۰۰روپے،موبائل نمبر:۹۴۳۰۸۷۵۴۲۴

مسلم علماء کا مطالعہ ہندو دھرم: ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی، فرید بک ڈپو(پرائیویٹ)لمٹیڈ نئی دہلی، صفحات ۳۴۲،سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۳۵۰روپے،موبائل نمبر:۹۲۵۰۹۸۳۸۶۸۔

میرے وطن کی خوشبو(شعری مجموعہ): عذرا نقوی، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ)لمٹیڈ نئی دہلی، صفحات ۱۱۸،سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۱۵۰روپے،موبائل نمبر:۹۵۵۰۸۷۰۸۲۸۔

ہندی ادب میں مسلم ادیبوں کا حصہ: ڈاکٹر آصف عمر،مترجم: فاروق ارگلی، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ)لمٹیڈ نئی دہلی، صفحات ۲۱۶،سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۲۵۰روپے،موبائل نمبر:۹۷۱۷۹۸۸۳۲۸۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	250/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print **JUN 2023** Vol. 210/06

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	״ ״	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	״ ״	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	״ ״	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	״ ״	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	״ ״	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-